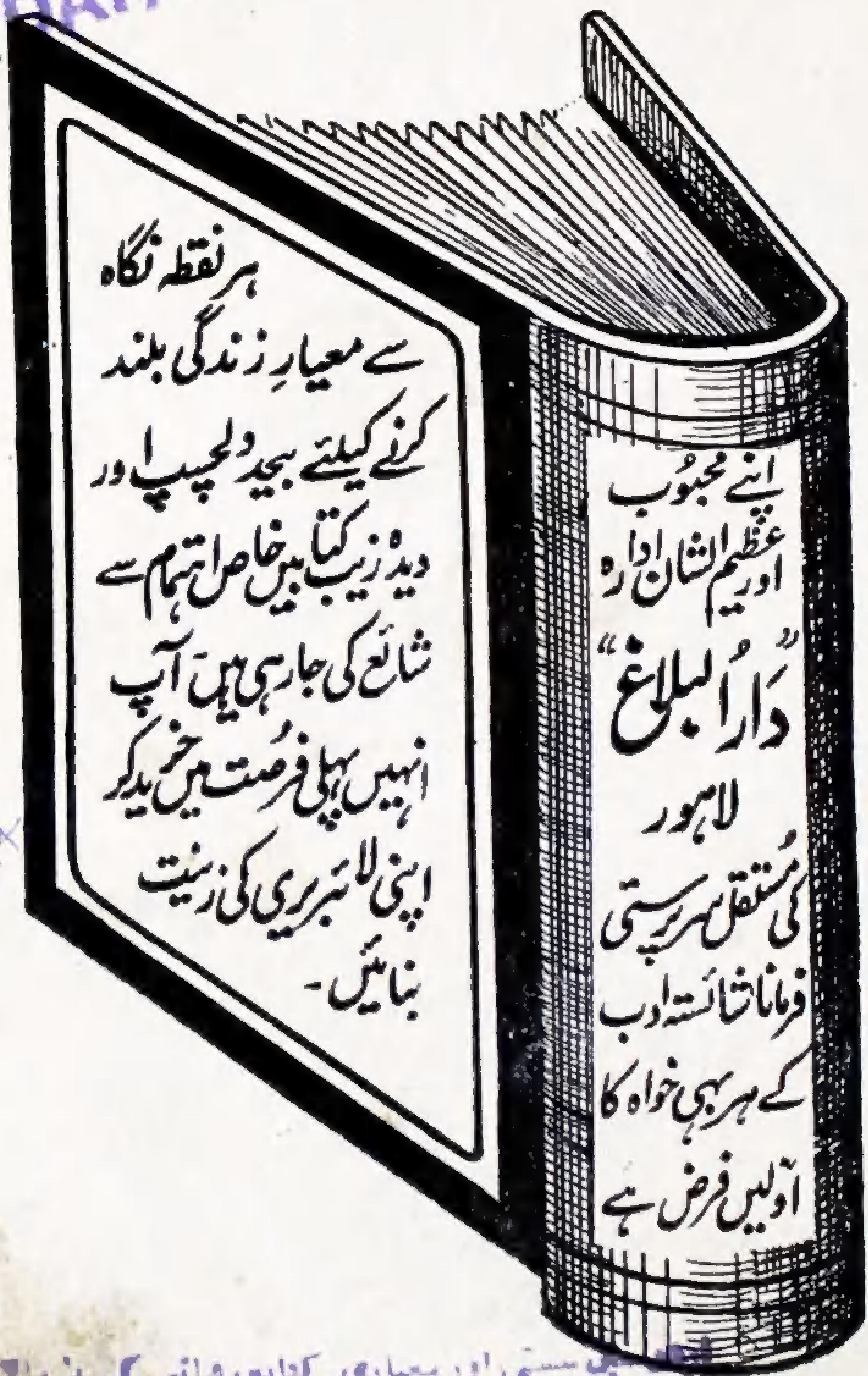


ہر نقطہ نگاہ
سے معیارِ زندگی بلند
کرنے کیلئے بجید دلچسپ اور
دیدہ زیب کتابیں خاص اہتمام سے
شائع کی جارہی ہیں۔ آپ
انہیں پہلی فرصت میں خریدکر
اپنی لائبریری کی زینت
بنائیں۔
اپنے محبوب
اور عظیم الشان ادارہ
"دارُالبلاغ"
لاہور
کی مستقل سرپرستی
فرمانا شائستہ ادب
کے ہر بہی خواہ کا
اوّلین فرض ہے

وجۂ تالیف

از

خواجہ بدرالسلام فروغی

چند روز ہوئے ایک عزیز دوست سے ملنے صبح کی گاڑی لاہور سے قصور گیا اور درمیانے درجے میں سوار ہوا۔ اس میں درمیانہ درجے کا نیا ڈبہ بڑا خوبصورت اور آرام دہ لگایا گیا ہے میں اسی میں بیٹھا۔ ایک ریلوے ملازم بھی جو میرا واقف تھا۔ اسی ڈبے میں آ بیٹھا۔ معلوم ہوا کہ راستے میں ان کے ایک دوست نے چند ریلوے ملازمین کو آموں کی دعوت دے رکھی ہے گاڑی چلنے میں ابھی چند منٹ باقی تھے کہ ان صاحب کے پانچ چھ احباب بھی آ پہنچے اور اسی ڈبے میں در آئے حالانکہ ان کے پاس تیسرے درجے کے ٹکٹ تھے۔ گاڑی چلی تو باتیں شروع ہوئیں۔ ایک صاحب نے کہا کتنے خوبصورت نئے ڈبے آئے ہیں مگر یہاں کے بعض بے شعور لوگوں نے ان ڈبوں کو خراب کر کے پبلک اور ریلوے کو نقصان پہنچایا ہے۔ ایک اور صاحب بولے پنکھوں کے سوئچ توڑ دیئے ہیں اور پنکھوں کو بھی غلط انداز سے ہاتھ ڈال کر نکما کر دیا

ہے۔ تیسرے صاحب نے کہا لوگوں کی عادات بالکل خراب ہیں۔ زندگی میں نظم و نسق کا فقدان ہے۔ لوگ قانون کا بھی احترام نہیں کرتے۔ انہیں کے ساتھی نے جو بہرے واقف تھے برجستہ فقرہ چست کیا۔ فرمانے لگے اسی لئے تیسرے درجے کے ٹکٹ لے کر دو میلے درجے میں آپ حضرات تشریف فرما ہیں۔ خود را فضیحت، دیگراں را نصیحت۔ یہ سن کر ایک زوردار قہقہہ اٹھا اور وہ نکتہ چین حضرات گھسیانی بلی کی طرح منہ بسورنے لگے۔

میں خاموش بیٹھا یہ سب تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج ہماری قوم کا ہر فرد نکتہ چین بنا ہوا ہے مگر جب ہر فرد خود غلط کار ہو تو دوسروں کو برا بھلا کہنے سے کیا حاصل۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ ہر شخص اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا جائزہ لے اور قوت ارادی سے کام لے کر ان پر قابو پانے کی صدق دلانہ کوشش کرے۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

بینی جہاں را خود را نہ بینی

تا چند نادان غافل نشینی

یعنے دنیا جہان کی خامیوں کو دیکھتا ہے مگر خود اپنی خامیوں کو نہیں دیکھتا۔ اے نادان تو کب تک یوں ہی غافل بیٹھا رہے گا۔ کاش ہر شخص لمحات فرصت میں اپنی گھات میں بیٹھ کر اپنا محاسبہ کر سکتا اور اپنی ایک ایک کمزوری کو اپنی شخصیت سے نکال باہر پھینکتا۔ اسی طرح جیسے ہم اپنے خانہ باغ کی سبز پوش زمین سے ہر ایک تکلیف دہ کنکر اور چبھنے والا خار نکال باہر پھینکتے ہیں۔ کاش ہم اپنی ہستی ناپائیدار کے دامن کو صرف خوبیوں اور نیکیوں ہی کے پھولوں سے بھر سکتے

ایک اعتبار سے اعمال و افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حقوق العباد اور عبادات۔ ہمارے معاشرے میں اکثریت تو ایسے لوگوں کی ہے جو ان دونوں صفات سے عاری ہیں۔ اور جو اچھے لوگ ہیں وہ اگر حقوق العباد کا خیال رکھتے ہیں تو عبادات سے منہ موڑے ہوئے ہیں۔ اور جو عبادات و ریاضات میں کوشاں ہیں وہ حقوق العباد کی ادائیگی میں کمزور ہیں۔ حالانکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں یہ دونوں صفات بیک وقت موجود ہوں۔

ایک مقولہ ہے کہ اپنے کام کا ہر کوئی چور ہوتا ہے۔ گویا جو شخص جس پیشے میں مصروف ہے اس میں وہ دیانت دار اور مخلص نہیں ہوتا، اور پیشہ ہی زندگی کا وہ پہلو ہے جس کا دوسروں یعنی معاشرے سے تعلق ہے۔ ہماری اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ ہمارا سارا معاشرہ اندر ہی اندر زحمت اور مصیبت میں مبتلا ہے۔

ان کمزوریوں کے علاوہ مادہ پرست یورپ و امریکہ اور لادین روس و چین کے مادی غلبے نے بھی خصوصیت کے ساتھ ہماری تہذیب اور جنسی زندگی پر زبردست برا اثر ڈالا ہے۔ آج کا تعلیم یافتہ نوجوان منہ سے تو خدا کی ہستی کو مانتا ہے مگر دل سے اس حقیقت ثابتہ پر یقین نہیں رکھتا اور نہ حیات بعد الممات کا صدق دل سے قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی تہذیبی تندیں درجہ بدرجہ رواج پا کر ہماری جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں اور یہ جنسی طغیان اور معاشرے میں مار دھاڑ کی کیفیت اسی وجہ سے ہے۔

قرون اولیٰ میں اسلام ایک زندہ تحریک تھی۔ اس تحریک کے علمبردار خدا کی ہستی پر کامل یقین رکھتے تھے۔ موت کے بعد ابدی زندگی کی صداقت پر ان کا ایمان

تھا حشرونشر اور دوزخ و بہشت کو وہ دل سے مانتے تھے یہی وجہ تھی کہ ان کی زندگیاں مثالی تھیں۔ وہ اس ناپائیدار زندگی کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ موت کا سچا نقشہ زندگی اور بھرپور زندگی میں بھی ان کے قلب و ذہن پر ثبت رہتا تھا۔ اگر اسی تصور حیات کو ہم زندگی میں جاری و ساری رکھ سکیں تو شاید ہم سے بہت ہی کم غلطیاں سرزد ہوں۔ اور موت کے وقت ہمیں زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے

زیر نظر کتاب اسی پاکیزہ جذبے کے پیش نظر مرتب ہوئی ہے تاکہ قارئین کرام پر اس کے مطالعہ سے عبرت و فکر کی نئی راہیں کھل سکیں۔ ناسمجھ انسان زندگی کے چکر میں پھنس کر دنیائے دوں کی الجھنوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ بنا بریں یہ کتاب ان کی آنکھیں کھول دے گی اور قارئین زندگی کی اتھاہ کو پا سکیں گے۔ مشاہیر اسلام کی زندگی کے اس حصے پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے جب ان کی زندگی کا چراغ گل ہو رہا تھا اس وقت کے احساسات و خیالات کو اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ قارئین اپنے حالات و ماحول سے تقابل کر کے زندگی کی بہتر قدریں معین کر سکیں گے

مشہور و نامور مصنف جناب عبدالرحمان طارق ملی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے میری درخواست پر بڑی ہی کاوش اور عرق ریزی سے یہ نہایت درجہ مفید کتاب تالیف فرمائی ہے۔ خدا کرے اسے قبول عام حاصل ہو اور تعلیم یافتہ طبقہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

دارالبلاغ • لاہور

سانحۂ موت

(قرآن و حدیث کی روشنی میں)

موت اس قدر تلخ و ناگوار حقیقت ہونے کے باوجود اسی وقت سے مصروف عمل ہے جب سے روئے زمین پہ ہبوطِ آدمؑ ہوا اور نسلِ انسانی وسعتہائے عالم میں پھیلنے لگی۔ اس کا دستِ تصرف بادشاہ اور فقیر، امیر و غریب، طاقتور اور کمزور، حاکم اور محکوم، ظالم اور مظلوم، مومن اور کافر، متقی اور فاسق، حتیٰ کہ پیغمبر اور امتی سبھی پر پوری قوت و توانائی سے حاوی رہا ہے، اور کوئی بھی اس کی اٹل گرفت سے راہِ گریز اختیار نہیں کر سکا۔ ہاں اتنا فرق ضرور ہے کہ بنی نوعِ انسان میں سے کسی نے تو موت کو بہرحال ایک یقینی اور ناقابلِ مقاومت حقیقت سمجھ کر اسے کبھی فراموش نہ ہونے دیا، اس کی آمد سے پیشتر زیادہ سے زیادہ توشۂ عقبیٰ فراہم کیا، لہٰذا جب وہ آئی تو جرأت و بے باکی اور خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا، اور اس انداز میں کیا جیسے برسوں سے اس کا منتظر تھا اور اس صورتِ حال کے برعکس کسی نے

اس کی آمد کے آثار دیکھتے ہی واویلا اور چیخ و پکار شروع کر دی، اضطراب اور خوف و ہراس کی شدت میں موت کے چنگل سے نجات پانے کی تمام ممکن تدابیر اختیار کیں، حتیٰ کہ اس مقصد کے لئے اوچھے اور ظالمانہ حربے بھی استعمال کئے، لیکن ہر پہلو سے شکست فاش ہوئی، اور بالآخر اسے موت کے فولادی پنجے نے دبوچ ہی لیا۔ ایسے لوگوں کے خوف و ہراس اور اضطراب و اکراہ کی وجہ کیا تھی؟ یہی کہ انہوں نے موت کو ایک اٹل حقیقت سمجھتے ہوئے بھی اسے دیدہ و دانستہ فراموش کئے رکھا، اور اس کی آمد سے پیشتر اعمال صالح کا کوئی ایسا ذخیرہ فراہم نہ کیا جو انہیں سکراتِ موت اور مابعد کی تکلیفوں اور سختیوں سے محفوظ و مصئون رکھتا۔

اس کتاب میں آپ اسی دائمی اور ابدی حقیقت کے مختلف عوامل و کوائف ملاحظہ فرمائیں گے جو ایک ٹھوس اور تعمیری مقصد کے حامل ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے قرآن حکیم کی چند آیات درج کی جاتی ہیں، جو موت سے متعلق عبرت و موعظت اور پند و نصیحت کا عظیم سرمایہ لئے ہوئے ہیں۔

موت کا ذکر قرآن حکیم میں

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثًا وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ ۝
(پ ۱۸ : ۶)

کیا تم لوگ اس غلط فہمی اور خام خیالی میں مبتلا ہو کہ ہم نے تمہیں دنیا میں بے مقصد اور بے نتیجہ پیدا کیا ہے اور تم روزِ محشر ہماری جانب نہیں لوٹائے جاؤ گے؟

وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

(پ ۱ : ع ۱۰)

عمر دے دی جائے۔ اور محض اتنی طویل عمر دے دیا جانا تو اسے عذاب الٰہی سے نہیں بچا سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ خوب دیکھ رہا ہے جو کچھ تم کرتے ہو!

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

(پ ۲۸ : ع ۱۰)

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں سے کہیے کہ دنیا کے عیش ونشاط میں سرمست ہو کر جس موت سے تم بھاگ رہے ہو، وہ ایک نہ ایک دن ضرور تمہیں مغلوب کرے گی۔ بعدازاں تم سب ہر غائب اور موجود شے کے عالم کی جانب لوٹائے جاؤ گے اور وہ تمہیں آگاہ کریگا کہ تم دنیا میں کیا کچھ کرتے تھے۔

وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ ۙ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا

اے لوگو! اس مال میں سے جو ہم نے تمہیں دے رکھا ہے، فی سبیل اللہ خرچ کرو اس سے پیشتر کہ تم میں سے کسی شخص کے پاس موت آئے اور (دم واپسیں) وہ کہنے لگے کہ اے پروردگار! کاش! تو مجھے کچھ عرصے کیلئے مہلت دے کہ میں اس کے دوران صدقہ وخیرات کروں اور تیرے نیک بندوں میں شامل ہو جاؤں" اور حقیقت یہ ہے کہ جب کسی شخص کے لمحات موت آجائیں، تو اللہ تعالیٰ

وَاللّٰهُ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ٥ (پ ۲۸ ع ۱۴)

اسے ہرگز مہلت نہیں دیا کرتا، اور اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے اچھی طرح باخبر ہے۔

موت کا ذکر احادیثِ نبویؐ میں

آیاتِ قرآنی کے بعد احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ ہے جو مضامینِ مطالبِ قرآن کے لیے تفسیر و تشریح کا حکم رکھتی ہیں۔ لہٰذا اب ارشاداتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ایسا مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے جو سانحہ موت کے اصلاحی اور تادیبی مقاصد کو اجاگر کرے۔ ذیل کی احادیث بغور ملاحظہ ہوں۔

یتبع المیت ثلثة اهله وماله وعمله فیرجع اثنان ویبقی واحد یرجع اهله وماله ویبقی عمله (الشیخان والترمذی)

میت کے ساتھ تین چیزیں جاتی ہیں اس کے لواحق، اس کا مال، اور اس کے اعمال۔ پس (بعد دفن) دو چیزیں تو واپس آجاتی ہیں اور ایک پیچھے رہ جاتی ہے۔ یعنی لواحق اور مال واپس آجاتے ہیں، اور اعمال اس کے ساتھ رہ جاتے ہیں!

مَا مِنْ اَحَدٍ يَمُوْتُ اِلَّا نَدِمَ اِنْ كَانَ مُحْسِنًا نَدِمَ اَنْ لَا يَكُوْنَ اِزْدَادَ وَاِنْ كَانَ مُسِيْئًا نَدِمَ اَنْ لَا يَكُوْنَ نَزَعَ (الترمذی)

کوئی شخص ایسا نہیں کہ مرے اور پشیمان نہ ہو۔ اگر وہ نیک ہو تو اس بات پر پشیمان ہوتا ہے کہ کیوں زیادہ نیکی نہ کی۔ اگر بد ہے تو اس بات پر پشیمان ہوتا ہے کہ کیوں بدی سے باز نہ رہا۔

إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا ثَلٰثَةٌ صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ أَوْ عِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ أَوْ وَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُو لَهُ

(مسلم)

جب انسان مر جاتا ہے تو اس کے اعمال کا خاتمہ ہو جاتا ہے، سوائے تین عملوں کے کہ وہ جاری رہتے ہیں (۱) صدقہ جاریہ (۲) علم جس سے خلق خدا کو فائدہ پہنچے (۳) نیک بخت بیٹا جو بعدِ وفات اس کے لیے دعا کرتا ہے

مُرَّ بِجَنَازَةٍ فَقَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُسْتَرِيحٌ أَوْ مُسْتَرَاحٌ مِنْهُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا الْمُسْتَرِيحُ وَمَا الْمُسْتَرَاحُ مِنْهُ قَالَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ يَسْتَرِيحُ مِنْ نَصَبِ الدُّنْيَا وَوَصَبِهَا وَالْفَاجِرُ يَسْتَرِيحُ مِنْهُ الْعِبَادُ وَالْبِلَادُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ (النسائی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنازے کے پاس سے گذرے فرمایا اس کی روح آرام پانے والی ہے یا آرام دینے والی ہے" لوگوں نے پوچھا "یا رسول اللہ! آرام پانے والی اور آرام دینے والی کے کیا معنے؟" فرمایا ایمان دار آدمی مر کر دنیا کے دکھ درد سے آرام پا جاتا ہے، لیکن فاسق وفاجر اور شریر آدمی کے مرنے سے بندے، بستیاں، درخت اور جانور آرام پاتے ہیں۔"

أَسْرِعُوا بِالْجَنَازَةِ فَإِنْ تَكُ صَالِحَةً فَخَيْرٌ تُقَدِّمُونَهَا

[illegible]

تم جنازے کو جلدی سے جایا کرو۔ کیونکہ اگر وہ نیک ہے تو تم اسے اگلے جہان کا اجر وثواب جلد تر جا [illegible] ہو۔ اور اگر وہ نیکو کار

تَشْتَرِ تَصْعَدُوْنَہٗ عَنْ ذِکْرِ اِیَّا یَکْرُو اِلیَمَۃ | نہیں ہے، تو بڑے گرگڑ دن سے جلد تا رتے ہو۔

زیارتِ قبور کی تاکید اور اس کے روحانی و اخلاقی فوائد

علاوہ ازیں احادیثِ نبویؐ میں زیارتِ قبور کی پے در پے تاکید پائی جاتی ہے، اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ روزانہ بعد نمازِ صبح زیارتِ قبور کے لئے تشریف لے جاتے تھے۔ اس باب میں حضورؐ نے جو کچھ فرمایا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ: جب قبرستان میں جاؤ تو زیادہ تر شکستہ اور بوسیدہ قبروں کو دیکھو کہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا نقشہ بہتر طور پر سامنے آتا ہے، زیادہ عبرت ہوتی ہے، دل سے غفلت کا زنگ اترتا ہے، اور وہ خوفِ الٰہی سے رقیق و گداز ہو جاتا ہے۔ مزید برآں زیارتِ قبور سے حیاتِ بعد الممات اور حشر و نشر کی یقین دہانی ہوتی ہے جس سے انسان عبادت اور عملِ صالح میں کوشاں ہوتا ہے۔ زیارتِ قبور سے مومن اپنے سابقہ گناہوں پر پشیمان ہوتا ہے اور آئندہ کے لئے حضورِ حق تعالیٰ سے تائب ہوتا ہے۔ زیارتِ قبور بنی آدم کے دماغ سے غرور و نخوت کو یکسر زائل کر کے اس میں تواضع اور عجز و انکسار کی صفات پیدا کرتی ہے۔ زیارتِ قبور ایک مشرک اور فاسق و فاجر شخص کو بھی توحیدِ الٰہی اور تقویٰ کی جانب مائل کرنے کا موثر و کامیاب ذریعہ ہے۔ زیارتِ قبور کی روحانی اور اخلاقی اہمیت اور افادیت کا اس سے بہتر ثبوت کیا ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے موردِ وحی اور امام الانبیاء ہوتے ہوئے بھی اس کا التزام فرمایا۔ پھر امتی اس عمل کی افادیت سے کیوں محروم رہیں؟ — کثرتِ خواہشات

اتباعِ نفسِ امارہ، اور ہوسِ مادیات کی پلیٹ میں آ کر ایک فراموش شدہ حقیقت اور لازمی انجام کا مشاہدہ کیوں نہ کیا جائے، تاکہ سیرت و کردار کی اصلاح ہو؟

مرگِ کافر اور مرگِ مومن میں فرقِ عظیم

ظاہر ہے کہ مرگِ کافر اور مرگِ مومن نتیجہ و اثر اندازی کے لحاظ سے بالکل متضاد چیزیں ہیں۔ چونکہ کافر کا عقیدہ یہ ہے کہ "ہمیں تو محض زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے"[۱۵] اور وہ حیات بعد الممات، حشر و نشر، حساب و کتاب، اور جزا و سزا پر ایمان ہی نہیں رکھتا، اور اس کے نزدیک زندگی آخری سانس کے ساتھ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو جاتی ہے، لہٰذا جب اس کی موت کا وقت قریب آتا ہے، تو وہ مال و جائیداد سے محروم ہونے۔ اور دنیوی عیش و عشرت کے ختم ہو جانے کا تصور کرتے ہی کپکپا اٹھتا ہے، ہر طرف حسرت و افسوس سے نظر آتا ہے، اور بایں ہمہ خوف و ہراس وہ حملۂ موت کے سامنے مجبور و بے بس ہو کر رہ جاتا ہے لیکن مردِ مومن کی کیفیت اس کے بالکل برعکس ہے چونکہ اس کے عقائد کلام اللہ کے ابدی حقائق پر مبنی ہیں، لہٰذا وہ حیاتِ بعد الممات حشر و نشر اور جزا و سزا پہ یقینِ محکم رکھتا ہے۔ حسبِ آیاتِ قرآنی اس کا غیر متزلزل ایمان ہے۔ کہ سانحہ موت کے ساتھ ہی

---

[۱۵] آیہ شریفہ:۔ وَقَالُوْا مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (۲۵، ۴/۲۴)

ترجمہ کفار نے کہا جو کچھ بھی ہے ہماری دنیوی زندگی ہی ہے ہمیں ہم زندہ رہتے اور مر جاتے ہیں اور ہمیں رضا نہیں بلکہ زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔

عالمِ سفلی کی عارضی اور فانی زندگی تو ختم ہوئی، لیکن فوراً بعد ایک دائمی، ابدی اور غیر فانی زندگی کا دروازہ کھل رہا ہے۔ حیات دنیوی کے نشیب و فراز اور مصائب و آلام سے تو نجات پائی، لیکن عنقریب دیدارِ الٰہی، مسرتِ بے پایاں اور نعمت ہائے جنت سے مستفید ہوا چاہتا ہوں۔ یہ مژدہ جاں فزا اسے ان ہی آخری لمحات میں سنایا جاتا ہے کہ:۔

يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝
فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝

ترجمۃ :۔ اے (توحید اور ذکر الٰہی سے) مطمئن روح! اپنے پروردگار کی طرف لوٹ آ، درآں حالیکہ تو اس سے راضی ہے، اور وہ تجھ سے۔ اب میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا، اور پھر میری جنت میں داخل ہو جا (پ ۳۰ : ۱۴ ع)

بنابریں نہ تو اس پر کسی قسم کا رنج و اضطراب طاری ہوتا ہے، اور نہ وہ موت کے قریب سے خوفزدہ ہوتا ہے بلکہ ایمان و یقین کی بے پناہ قوت رکھتے ہوئے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کرتا ہے:۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم؟
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست! (اقبال)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مرگِ کافر اور مرگِ مومن کی یہ متضاد کیفیات مندرجہ ذیل حدیث میں نہایت بلیغ و مؤثر انداز سے بیان فرمائی ہیں:۔

مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ اَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهٗ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ	جو شخص خدا سے ملنا چاہے خدا بھی اسے ملنا چاہتا ہے اور جو خدا سے ملنا پسند نہیں کرتا، خدا بھی اس سے

كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ فَقَالَتْ عَائِشَةُ
إِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ، قَالَ لَيْسَ
ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا
حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ
بِرِضْوَانِ اللّٰهِ وَكَرَامَتِهٖ فَلَيْسَ
شَيْءٌ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ،
فَأَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ وَأَحَبَّ اللّٰهُ
لِقَاءَهُ، وَإِنَّ الْكَافِرَ إِذَا حُضِرَ
الْمَوْتُ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللّٰهِ تَعَالٰى
وَعُقُوْبَتِهٖ فَلَيْسَ شَيْءٌ
أَكْرَهَ إِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ
فَكَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ وَكَرِهَ اللّٰهُ
لِقَاءَهُ (بخاری و مسلم)

ملنا پسند نہیں کرتا۔ عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سب موت سے نفرت کرتے ہیں۔" فرمایا" یہ بات نہیں، بلکہ مومن کے سامنے جب موت آتی ہے اور اسے خدا کی رضامندی اور کرم کی خوشخبری دی جاتی ہے، تو کوئی چیز اسے موت سے زیادہ پیاری نہیں لگتی۔ پس وہ خدا تعالےٰ سے ملنا چاہتا ہے، اور خدا اس سے ملنا چاہتا ہے اور جب منکر کے سامنے موت آتی ہے اور اسے عذابِ الٰہی کی خبر دی جاتی ہے، تو موت سے زیادہ اسے کوئی چیز بری نہیں لگتی۔ لہٰذا وہ خدا کے ملنے سے نفرت کرتا ہے، اور خدا بھی اس کو ملنے سے نفرت کرتا ہے۔

اعترافِ حقیقت و صداقت کے اہم ترین لمحات

نوعِ انسانی میں سے بالخصوص کفار و منافقین اور فاسق و فاجر لوگوں میں یہ عام خامی ہے کہ جب تک وہ تندرست و توانا، خوشحال اور محوِ عیش عشرت رہتے ہیں، اپنے نہایت واضح، معلوم و مشہود اور غیر مبہم معائب و مظالم کا بھی اعتراف نہیں کرتے، بلکہ دیدہ و دانستہ طور پر ہٹ دھرمی سے انہیں نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔

اور اگر کوئی حق گو شخص بغرضِ اصلاح کبھی ان معائب کا تذکرہ کر بھی دے، تو ان کے نزدیک ایک گردن زدنی مجرم قرار پاتا ہے لیکن آستانۂ موت پر پہنچ کر ایسے تمام شقی القلب لوگوں کی رعونت و نخوت کافور ہو جاتی ہے، اور جس حقیقت و صداقت کا اعتراف انہوں نے عمر بھر نہیں کیا تھا، اور مخلص و ہمدرد دوستوں کے کہنے پر بھی نہیں کیا تھا، موت کے چنگل میں مجبور و بے بس ہو کر وہ اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن صد حیف، کہ یہ اعتراف بے وقت ہے، انتہائی تاخیر سے ہے، و درگاہِ خداوندی میں مسترد ہے، اور ایسے اعتراف کے لئے تلافی مافات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ آستانۂ موت پر جولیس سیزر، سکندرِ اعظم اور نپولین جیسے آمر مطلق، جو تمام دنیا کو مفتوح و مسخر کرنے کے خواب دیکھتے ہیں، خود مفتوح و شکست خوردہ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں چنگیز و ہلاکو جیسے جابر و مستبد اور ظالم و سفاک فرمانروا بھی اپنے تمام سابقہ مظالم پر نادم ہوتے ہوئے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دیتے ہیں۔ یہاں حجاج بن یوسف جیسے پیکرِ ظلم و ستم کو بھی، جس کا یہ عقیدہ تھا کہ حکومتیں رحم و عدل سے نہیں، بلکہ جبر و تشدد اور قہر و تعزیر سے قائم ہوتی ہیں، بالآخر پھوٹ پھوٹ کر رونا پڑا، اور نزع کے عالم میں بولا "شدید مصیبت، سخت تکلیف، ناقابلِ بیان رنج و الم، ناقابلِ برداشت درد! — آہ! میری ہلاکت، اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کھایا!" ہاں، آستانۂ موت پر پسرِ نوحؑ جیسا کافر و منکر جو اتنے جلیل الشان نبی کی تذلیل و تضحیک کیا کرتا تھا، طوفان میں گھر کر دمِ واپسیں تو بیدِ ندامت کا اظہار کرتا ہے، لیکن بے سود یہی وہ اٹل گھڑی ہے جس میں تاریخ کا ایک عظیم سرمایہ دار، قارون، جو اس موضوع پر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اپنے خزائن سمیت واویلا

کرتا ہوا خشک زمین میں غرق کر دیا جاتا ہے، اور اپنے مظالم کا اعتراف اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ یہی وہ وقت ہے جبکہ نسلِ آدمؑ کا بدترین مجرم یعنی فرعون، جس نے بارہا "انا ربکم الاعلیٰ" کا اعلان کرتے ہوئے خدائی کا دعویٰ کیا، نیل کی غضبناک موجوں میں تھپیڑے کھاتا ہوا بالآخر اس حقیقت و صداقت کا اعتراف کرتا ہے کہ میں اس رب واحد پہ ایمان لاتا ہوں، جس پہ بنی اسرائیل ایمان لا چکے ہیں، اور میں مسلمان ہوں[1] لیکن آخری لمحاتِ زلیست کا یہ ایمان اس کے لئے قطعاً سودمند ثابت نہیں ہوتا۔ معاویہ بن ابی سفیان نے نزع کے عالم میں بصد حسرت اندوہ کہا: "معاویہ! تو بیٹھے اب کر اب یاد کرتا ہے جب کہ بڑھاپے نے کسی کام کا نہیں رکھا اور جسم کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ اس وقت کیوں خیال نہ آیا جب شباب کی ڈالی تر و تازہ اور ہری بھری تھی" اس تمام گفتگو کا حاصل مقصد یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص موت سے پہلے پہلے "معروف" اور "مفید" اعترافِ حقیقت کی اہمیت و افادیت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور اس اعتراف کے ساتھ ہی ساتھ تلافیِ مافات میں بھی بہ خلوص نیت ساعی ہو۔ بالفاظِ دیگر زندگی کے آخری لمحات میں جن حقائق کا اعتراف ہر شخص کو کرنا ہے، اور طوعاً و کرہاً کرنا ہے، دراں حالیکہ وہ اعتراف ہر جہت سے فضول و لاحاصل ہوگا، ان کا اعتراف آج ہی کیوں نہ کیا جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا باعث ہو، اور مستقبل میں پیش از مرگ گذشتہ گناہوں اور حق تلفیوں کی خاطر خواہ تلافی بھی ہو سکے!

---

[1] آیۂ شریفہ کے لئے دیکھئے (پ ۱۱ ع ۱۴)

مقصدِ کتاب ہذا

مندرجہ بالا عنوانات اور مباحث کی روشنی میں پیشِ نظر کتاب کا حقیقی مقصد بالکل واضح ہے۔ اس میں مشاہیر اسلام کی زندگی کے آخری ایام و لمحات کا ایک قدرتی اور غیر مصنوعی مرقع پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا ان ایام میں ان کے حالات و کوائف اور اقوال و ارشادات اپنے اندر پند و موعظت، تلقین و تادیب، اور عبرت و نصیحت کا ایک وسیع ذخیرہ لئے ہوئے ہیں، جو ہر مسلمان کے لئے نہ صرف تزکیۂ قلب کا موجب ہوں گے بلکہ ان کا مطالعہ اصلاحِ اعمال میں بھی بے انتہا ممد و معاون ثابت ہوگا۔ ظاہر ہے کہ محض خیالی افسانوں اور ہوس انگیز قسم کے جنسی لٹریچر کی نسبت ان مبنی بر حقائق واقعات و سوانح کا مطالعہ علمی، روحانی، اخلاقی اور معاشرتی لحاظ سے کس قدر مفید و بصیرت افروز ہے! لہٰذا اسے خود کامل غور و انہماک سے پڑھیے، اہل و عیال کو پڑھائیے، لواحقین و احباب کو اس کے مطالعہ کی رغبت دلائیے، اور اس طرح اس کتاب کے تبلیغی اور اصلاحی مقاصد میں خود بھی حصہ دار بن جائیے، جو ہر مسلمان کا فطری اور قدرتی حق ہے!

بالآخر میں خواجہ بدر السلام صاحب فروغی مہتمم دار البلاغ لاہور کا ممنون ہوں، جنہوں نے ایسے تعمیری موضوع پر کتاب تیار کرنے کی تجویز پیش کی اور اس ذیل میں مفید مشورے بھی دیئے۔ آپ نہ صرف ایک سلجھے ہوئے اور سلیقہ شعار ناشر ہیں، بلکہ شعر و ادب کا بھی نہایت اچھا ذوق رکھتے ہیں جس کا واضح ثبوت آپ کی تازہ تصنیف "جمالِ زندگی" ہے۔ اردو سے آپ کو والہانہ عشق ہے اور اس میں

مسلمانانِ پاکستان کے لئے صحتمند الخیال افرمند اور اصلاحی و تعمیری لٹریچر پیش کرنے کا ولولہ بھی رکھتے ہیں۔ امید ہے کہ اُن کے اشتراکِ عمل اور مخلصانہ تعاون سے میں بعض دیگر اہم موضوعات پر بھی اپنی تالیفات و نگارشات ہدیہ قارئین کروں گا۔

عبدالرحمان طارق

رحلتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ مے آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

یہ اس ہستیٔ مقدس کے آخری ایام زندگی کا تذکرہ ہے جو مختلف آیات قرآنی کی رو سے "رحمۃ للعالمین" بھی تھی "حامل خلق عظیم" بھی تھی، نہ صرف مسلمانوں کے لئے بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے "بشیر و نذیر" بھی تھی، معراج کی سعادت عظمیٰ پا کر "صاحب قاب قوسین"[1] بھی تھی، "امام الانبیاء" بھی تھی اور "خاتم المرسلین" بھی!

یہ اس ہستی مقدس کے آخری لمحات کا تذکرہ ہے جس کی اطاعت کو قرآن اللہ تعالیٰ

---

[1] یعنے معراج کی رات میں اللہ میاں نبیؐ اس طرح مل بیٹھے جیسے کمان کے دو سرے مل جاتے ہیں یا اس سے بھی قریب تر۔ (ترجمہ آیۃ شریفہ)

کی اطاعت قرار دیتا ہے جس کی بیعت گویا دستِ خداوندی پر بیعت تھی، اور دشمنانِ اسلام کی جانب جس کے پھینکے ہوئے کنکر درحقیقت اللہ تعالیٰ نے پھینکے تھے اور جس کے سینۂ پُرنور اس کلام برحق کا مرکز و مرجع تھا، جس کا دوام تا قیامت معہود و مسلم ہے!

حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے بعد مدینہ منورہ میں پہنچ کر فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کی تعمیل میں مصروف ہو چکے تھے، اور بارگاہِ ایزدی کی حاضری کا شوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ صبح و شام معبودِ حقیقی کے ذکر و تسبیح اور طلبِ مغفرت کے سوا آپؐ کی توجہ اور کسی طرف نہیں تھی۔

رمضان المبارک میں ہمیشہ دس روز کا اعتکاف فرماتے تھے، لیکن سنہ ۱۰ھ میں بیس روز کا اعتکاف فرمایا۔ ایک دن حضرت فاطمہ بتولؓ تشریف لائیں، تو ان سے فرمایا! "پیاری بیٹی! اب مجھے اپنی رحلت قریب معلوم ہوتی ہے۔" ان ہی ایام میں شہدائے احد کی تکلیف، بے بسی کی شہادت، اور مردانہ وار قربانیوں کا خیال آ گیا تو گنجِ شہیداں میں تشریف لے گئے اور بڑے درد و گداز سے ان کے لئے دعائیں کیں، نمازِ جنازہ پڑھی، اور انہیں اس طرح الوداع کہی جس طرح ایک مشفق و دردمند بزرگ اپنے کم سن بچوں سے پیار کرتا ہے، اور پھر انہیں الوداع کہتا ہے۔ یہاں سے واپس آئے تو منبرِ نبوی پر جلوہ طراز ہوئے اور اپنے تربیت یافتہ اربابِ صدق و صفا سے نہایت پُرخلوص اور رقت انگیز لہجہ میں مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا۔

"دوستو! اب میں تم سے آگے منزلِ آخرت کی طرف چلا جا رہا ہوں، تاکہ بارگاہِ ایزدی میں تمہاری شہادت دوں۔ واللہ مجھے یہاں سے وہ اپنا حوض نظر

آرہا ہے جس کی وسعت ایلہ سے جحفہ تک ہے۔ مجھے تمام دنیا کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں۔ اب مجھے یہ خوف نہیں کہ میرے بعد تم شرک کروگے، البتہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دنیا کے فتنوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ، اور اس کے لئے آپس میں کشت و خون نہ کرو۔ اگر ایسا کروگے تو اسی طرح ہلاک و برباد ہو جاؤگے جس طرح پہلی قومیں ہلاک و برباد ہوئیں۔"

ان ایام میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال مبارک زیادہ تر گزرے ہوئے نیاز مندوں ہی کی طرف مائل محبت رہتا تھا۔ ایک رات آسودگان بقیع کا خیال آگیا۔ یہ عام مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ جوش محبت سے آدھی رات اٹھ کر وہاں تشریف لے گئے اور عام امتیوں کے لئے بڑے سوز سے دعا فرماتے رہے پھر یہاں کے روحانی دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: اَنَا بِکُمْ لَاحِقُوْنَ یعنی "اب میں بہت جلد تمہارے ساتھ شامل ہونے والا ہوں۔"

ایک دن حضورؐ نے مسجد نبویؐ میں پھر مسلمانوں کو یاد فرمایا۔ اجتماع ہو گیا، تو ارشاد فرمایا، مسلمانوں مرحبا! اللہ تعالیٰ تم سب پر اپنی نعمتیں نازل فرمائے، تمہاری دل شکستگی دور فرمائے، تمہاری اعانت و دستگیری فرمائے، تمہیں رزق اور برکت مرحمت فرمائے، تمہیں عزت و رفعت سے سرفراز فرمائے، تمہیں دولتِ امن و عافیت سے شادکام فرمائے۔ میں تمہیں اس وقت صرف خوفِ الٰہی اور تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں کہ یہی تمام بھلائیوں کی اساس ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ہی تمہارا وارث اور خلیفہ ہے اور میں تمہیں اسی سے خائف رہنے کی تاکید کرتا ہوں اس لئے کہ میرا منصب نذیر مبین ہے۔ دیکھنا اللہ کی بستیوں

اور نہ بندوں میں تکبر اور برتری اختیار نہ کرنا اور یہ حکم ربانی ہر وقت تمہارے ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔	یہ آخرت کا گھر ہے۔ ہم یہ ان لوگوں کو دیتے ہیں جو زمین میں غرور اور فتنہ وفساد کا ارادہ نہیں کرتے اور آخرت کی کامرانی پرہیزگاروں کے لئے ہے۔

پھر فرمایا: اَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِلْمُتَكَبِّرِينَ یعنی کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا دوزخ نہیں ہے؟" آخری الفاظ یہ ارشاد فرمائے: "سلام تم سب پر اور ان سب لوگوں پر جو واسطہ اسلام سے میری بیعت میں داخل ہوں گے۔"

حضورؐ کی علالت کا آغاز سر کے درد سے شروع ہوا حضرت ابوسعید خدری فرماتے تھے کہ سرکار دوعالم کے سر مبارک پر رومال بندھا تھا۔ میں نے ہاتھ لگایا تو یہ اس قدر جل رہا تھا کہ ہاتھ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دوشنبہ تک شدت مرض نے طبیعت پر زیادہ قابو پالیا، لہٰذا ازواج مطہرات نے اجازت دے دی کہ اب حضورؐ کا مستقل قیام حضرت عائشہ صدیقہ کے ہاں کر دیا جائے۔ اس وقت مزاج اقدس پر ضعف اس قدر طاری تھا کہ خود قدموں سے چل کر حجرۂ عائشہؓ تک تشریف نہیں لے جا سکے حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں بازو تھامے اور بڑی مشکل سے حجرۂ عائشہ میں تشریف لائے۔

وفات اقدس سے پانچ روز پہلے حضورؐ پتھر کے ایک ٹب میں بیٹھ گئے اور سر مبارک پر پانی کی سات مشکیں ڈلوائیں۔ اس سے مزاج اقدس میں خنکی اور تسکین

سی پیدا ہوگئی۔ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا، مسلمانو! تم سے پہلے ایک قوم گذر چکی ہے جس نے اپنے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا۔ تم ایسا نہ کرنا۔" پھر فرمایا! "ان یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو، جنہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔" پھر فرمایا "میری قبر کو میرے بعد وہ قبر نہ بنا دینا کہ اس کی پرستش شروع ہو جائے۔" پھر فرمایا! "مسلمانو! وہ قوم اللہ کے غضب میں آجاتی ہے، جو قبور انبیاء کو مسجد بنا دے۔ دیکھو میں تم کو اس فعل سے منع کرتا ہوں! ـــ اے اللہ! تو گواہ رہ! اے اللہ! تو گواہ رہ! اے اللہ! تو گواہ رہ!"

بعد ازاں ارشاد فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار عطا فرمایا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا کو قبول کرے، یا آخرت کو۔ مگر اس نے صرف آخرت ہی کو قبول کرلیا ہے۔"

یہ سن کر رمز شناس نبوت حضرت صدیق اکبرؓ بے اختیار رونے لگے، اور کہا "یارسول اللہ! ہمارے ماں باپ، ہماری جانیں اور ہمارے زر و مال آپ پر قربان ہو جائیں۔" لوگوں نے ان کو تعجب سے دیکھا کہ حضور انور تو ایک شخص کا واقعہ بیان فرماتے ہیں، پھر اس میں رونے کی کونسی بات ہے؟ مگر یہ بات وہی سمجھ سکتے تھے جو رمز شناس تھے۔ حضرت صدیق کی اس بے کلی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خیال مبارک کو دوسری طرف مبذول کر دیا۔ ارشاد فرمایا:۔

"میں سب سے زیادہ جس شخص کی دولت اور رفاقت کا ممنون و شکر گذار ہوں، وہ ابوبکرؓ ہیں اگر میں اپنی امت میں کسی ایک شخص کو اپنی دوستی کے لئے منتخب کر سکتا تو وہ ابوبکرؓ ہوتے۔ لیکن اب میری دوستی کی بنا رشتۂ اسلام ہے اور وہی کافی ہے

مسجد کے رخ پر کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچہ کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔"

انصارِ مدینہ حضورؐ کے زمانہ علالت میں برابر روتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ وہاں سے گذرے تو انہوں نے انصار کو روتے دیکھا دریافت کرنے پر انہوں نے بتایا! "آج ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتیں یاد آ رہی ہیں" انصار کی اس دردمندی اور بے چینی کی اطلاع ... مبارک تک پہنچ چکی تھی ارشاد فرمایا:۔

"اے لوگو! میں اپنے انصار کے معاملہ میں تم کو وصیت کرتا ہوں۔ عام مسلمان روز بروز بڑھتے جائیں گے، مگر میرے انصار کھانے میں نمک کی طرح رہ جائیں گے یہ لوگ میرے جسم کا پیراہن ہیں اور میرے سفرِ زندگی کا توشہ ہیں۔ انہوں نے اپنے فرائض ادا کر دیئے، مگر ان کے حقوق باقی ہیں۔ جو شخص امت کے نفع اور نقصان کا متولی ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ انصار دل کو کار کی قدر افزائی کرے اور جن انصار سے لغزش ہو جائے، ان کے متعلق درگذر سے کام لے۔"

پھر فرمایا، "حلال و حرام کی تعین کو میری طرف منسوب نہ کرنا میں نے وہی چیز حلال کی ہے، جیسے قرآن نے حلال کیا ہے، اور اسی کو حرام کیا ہے، جیسے قرآن نے حرام بتایا ہے۔"

بعد ازاں آپ اہل بیعت کی طرف متوجہ ہوئے کہ کہیں رشتہ نبوت کا غرور انہیں سعی وعمل سے بیگانہ نہ بنا دے۔ ارشاد فرمایا:

"اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی فاطمہؓ! اور اے پیغمبرِ خدا کی پھوپھی صفیہ! حضورِ حق تعالیٰ نجات کے لئے کچھ کر لو میں تمہیں خدا کی گرفت سے نہیں

بچا سکتا۔"

یہ خطبہ در حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری خطبہ تھا جس میں حضور نے حاضرین مسجد کو مخاطب فرمایا۔ اختتام کلام کے بعد حجرۂ عائشہؓ میں تشریف لے آئے، شدتِ مرض کی حالت یہ تھی کہ عالمِ بے تابی میں کبھی ایک پاؤں پھیلاتے تھے اور کبھی دوسرا سمیٹتے تھے، کبھی گھبرا کر چہرۂ مبارک پر چادر ڈال لیتے تھے اور کبھی الٹا دیتے تھے۔ اسی حالت میں حضرت عائشہ صدیقہؓ نے زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سنے "یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔"

وفات سے چار روز پیشتر حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا "اپنے والد ابوبکرؓ اور اپنے بھائی عبدالرحمان کو بلا لو۔ اور دوات کاغذ بھی لے آؤ تاکہ میں ایک تحریر لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔" یہ شدتِ مرض میں حضور سرورِ عالم کا ایک خیال تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے رائے ظاہر کی کہ حضور کو اس حال میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ اب تکمیلِ شریعت کا کوئی ایسا نکتہ باقی نہیں رہا، جس میں قرآن کافی نہ ہو۔ بعض دوسرے صحابہ نے اس رائے سے مطابقت نہ کی۔ جب شور زیادہ ہوا تو بعض نے کہا "خود حضورؐ ہی سے دریافت کر لیا جائے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "مجھے چھوڑ دو میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔" اسی روز تین اور وصیتیں بیان فرمائیں، جو حسبِ ذیل ہیں :۔

۱۔ کوئی مشرک عرب میں نہ رہے۔

۲۔ سفیروں اور وفود کی بدستور عزت اور مہمان نوازی کی جائے۔

۳۔ کلام اللہ کے اوامر اور نواہی اور میری سنت پر ہمیشہ عامل رہو۔ اس طریق عمل سے تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے!

جب علالت اور ضعف و کمزوری میں اضافہ ہوا، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوشش کے باوجود نماز کے لئے مسجد میں تشریف نہ لا سکے، لہٰذا عائشہ صدیقہؓ سے فرمایا "ابوبکرؓ سے کہو کہ نماز پڑھا دیں" وہ بولیں "یا رسول اللہ! ابوبکرؓ نہایت رقیق القلب آدمی ہیں جب وہ آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو نماز نہیں پڑھا سکیں گے" لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "وہی نماز پڑھائیں" حضرت عائشہ کا خیال تھا کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام مقرر ہو گا، لوگ اسے لازماً منحوس خیال کریں گے۔ روایت ہے کہ اس وقت صدیق اکبرؓ تشریف فرما نہیں تھے۔ اس لئے حضرت عمرؓ کو آگے بڑھایا گیا، لیکن حضورؐ نے تین مرتبہ فرمایا نہیں نہیں، نہیں۔ ابوبکرؓ ہی نماز پڑھائیں" اس لپینا اور پے در پے تاکید سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس ارشاد کے در پردہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیقؓ ہی کو اپنے بعد خلیفہ منتخب فرما رہے تھے۔

رسول اللہؐ کا منبر چند روز پہلے خالی ہو چکا تھا۔ آج رسول اللہؐ کا مصلّیٰ بھی خالی ہو گیا۔ جب ابوبکر صدیقؓ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑے ہوئے تو عالم یاس و اندوہ نے مسجد نبویؐ پہ اپنے پردے تان دیئے، اور مسلمانوں کے دل بے اختیار رو دیئے اور خود ابوبکر صدیقؓ کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ارشاد کے ساتھ توفیق الٰہی شامل تھی، لہٰذا یہ کٹھن گھاٹی بھی گزر گئی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے حیات پاک نبویؐ میں اس طرح سترہ نمازیں پڑھائیں۔

حضرت صدیقؓ ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ حضورؐ کی طبیعت نے مسجد کی طرف رجوع کیا، اور حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے کندھوں پر سہارا لیتے ہوئے جماعت میں تشریف لے آئے۔ نمازی نہایت بے قراری کے ساتھ حضورؐ کی طرف متوجہ ہوئے اور صدیق اکبرؓ بھی مصلے سے پیچھے ہٹے۔ مگر حضورؐ نے دستِ مبارک سے ارشاد فرمایا پیچھے مت ہٹو۔ پھر حضرت صدیقؓ کے برابر بیٹھ گئے اور نماز ادا کرنے لگے۔ حضورؐ کی اقتدار صدیقِ اکبرؓ کرتے تھے اور صدیقؓ کی اقتدار مسلمان کرتے تھے۔ یہ نماز اسی طرح مکمل ہوئی، تو حضور پاک حجرۂ عائشہ میں تشریف لے گئے۔

پیشوائے انسانیت جو علائق دنیا سے آزاد ہو رہے تھے، صبح بیدار ہوئے تو پہلا کام یہ کیا کہ سب غلاموں کو آزاد فرمایا جو تعداد میں چالیس تھے پھر اثاث البیت کی طرف توجہ فرمائی۔ اس وقت کاشانۂ نبوی کی ساری دولت سات دینار تھے۔ حضرت عائشہ سے فرمایا: "انہیں غریبوں میں تقسیم کر دو مجھے شرم آتی ہے کہ رسولؐ اپنے اللہ سے ملے اور اس کے گھر میں دولت دنیا پڑی ہو۔" اس ارشاد پر گھر کا گھر صاف کر دیا گیا۔ آخری رات کاشانۂ نبوی میں چراغ جلانے کے لئے تیل تک موجود نہیں تھا یہ ایک پڑوسی عورت سے ادھار لیا گیا۔ گھر میں کچھ ہتھیار باقی تھے، جنہیں مسلمانوں کو ہبہ کر دیا گیا۔ ۹ ربیع الاول دوشنبہ کو مزاج اقدس میں قدرے سکون تھا۔ نماز صبح ادا کی جارہی تھی کہ حضورؐ نے مسجد اور حجرہ کا درمیانی پردہ سرکا دیا۔ اب چشم اقدس کے سامنے نمازیوں کی صفیں مصروف رکوع و سجود تھیں۔ سرکار دو عالم نے اس نظارے کو جو حضورؐ کی روح پرور تعلیم کا نتیجہ تھا۔ بڑے اشتیاق سے ملاحظہ فرمایا، اور جوش مسرت سے ہنس پڑے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ مسجد میں تشریف

لا رہے ہیں، نمازی بے اختیار سے ہو کر منتظر آمد ہوئے، اور حضرت صدیق رضؓ نے جو امامت کر رہے تھے پیچھے ہٹنا چاہا، مگر حضورؐ نے اشارۂ مبارک سے سب کو تسکین دی، اور چہرۂ مبارک کی ایک جھلک دکھا کر پھر حجرے کا پردہ ڈال دیا۔ اجتماع مسلمین کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جلوۂ زیارت آخری تھا اور شاید انتظام بھی خود قدرت کی طرف سے ہوا کہ رفیقانِ صلوٰۃ جمال جہاں آرا کی آخری جھلک دیکھتے جائیں۔

ضعف و نقاہت اور غشی کی انہیں تکلیفوں میں آنحضرتؐ نے پیاری بیٹی کو یاد فرمایا۔ وہ مزاج مقدس کا یہ حال دیکھ کر سنبھل نہ سکیں، اور سینہ مبارک سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگیں۔ بیٹی کو اس طرح نڈھال دیکھ کر ارشاد فرمایا: "میری بیٹی! رو نہیں، میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رٰجِعُوْن کہنا اسی میں ہر مسلمان کے لئے سامانِ تسکین موجود ہے۔" حضرت فاطمہؓ نے پوچھا "کیا آپ کے لئے بھی؟" فرمایا "ہاں، اس میں میری بھی تسکین مضمر ہے۔"

جس قدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور درد و اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اسی قدر حضرت فاطمہؓ بھی مضمحل اور رنجیدہ و پریشان ہوتی جاتی تھیں۔ حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اذیت کو محسوس کر کے کچھ کہنا چاہا، تو پیاری بیٹی نے سرورِ کائنات کے لبوں سے اپنے کان لگا دیئے۔ آپؐ نے فرمایا: "بیٹی میں آج دنیا کو چھوڑ رہا ہوں۔" فاطمہؓ بے اختیار رو دیں۔ پھر فرمایا "فاطمہ! میرے اہلِ بیت میں تم سب سے پہلے مجھے ملو گی۔" فاطمہؓ یہ سن کر بے اختیار ہنس دیں کہ جدائی کا یہ عرصہ قلیل ہے۔

پیغمبر انسانیت کی حالت نازک تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ حال دیکھ کر حضرت فاطمہؓ نے کہنا شروع کیا۔ "واکرب اباہ ہائے میرے باپ کی تکلیف" یہ سن کر فرمایا "فاطمہ! آج کے بعد تمہارا باپ کبھی بے چین نہیں ہوگا" حسنؓ اور حسینؓ بہت غمگین ہو رہے تھے۔ انہیں پاس بلایا، دونوں کو چوما، پھر ان کے احترام کی وصیت فرمائی۔ پھر ازواجِ مطہرات کو طلب فرمایا اور انہیں نصیحتیں فرمائیں۔ اسی دوران میں ارشاد فرماتے تھے:

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ "پروردگار مجھے ان لوگوں کے ساتھ واصل فرما جن پر تو نے انعام فرمایا ہے۔" کبھی ارشاد فرماتے تھے: اَللّٰهُمَّ اَلْحِقْنِیْ بِالرَّفِیْقِ الْاَعْلٰی "اے اللہ! مجھے میرے بلند و برتر رفیق (اللہ تعالیٰ) سے ملا" پھر حضرت علیؓ کو طلب فرمایا۔ آپ نے سر مبارک کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ انہیں بھی نصیحت فرمائی۔ بعد ازاں عامۃ المسلمین کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: "نماز کی حفاظت کرو اور اپنے لونڈی غلام کے حقوق کی نگہداشت کرو۔"

اب نزع کا وقت آ پہنچا تھا۔ حضور ؐ بی بی عائشہؓ کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پانی کا پیالہ پاس رکھا تھا، اس میں ہاتھ ڈالتے تھے اور چہرۂ پُرنور پر پھیر لیتے تھے۔ زبانِ مبارک آہستہ آہستہ ذکرِ الٰہی میں ہل رہی تھی۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَکَرَاتٍ "اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور موت کی اذیت لازمی ہے۔" اس دوران میں حضورؐ نے مسواک کی خواہش ظاہر کی۔ ام المومنینؓ نے مسواک دانتوں میں نرم کر کے پیش کی، اور آپ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک فرمائی، کیونکہ یہ حضورؐ کی محبوب ترین چیزوں میں سے تھی، اور فرمایا کرتے

تھے جبریل ؑ نے مجھے مسواک کی اس قدر تاکید کی ہے کہ میں سمجھا گویا یہ فرض ہے پھر حضور ؐ نے یکایک ہاتھ اونچا کیا جیسے اپنے محبوب حقیقی کی جانب تشریف لے جارہے ہوں، پھر زبان اقدس سے تین بار یہ الفاظ نکلے بَلِ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی (میں اپنے بلند و برتر رفیق سے واصل ہو رہا ہوں) تیسری آواز پر ہاتھ لٹک آئے، پتلی اوپر کو اٹھ گئی، اور روح شریف عالم قدس کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ عَلَیْہِ

خطبۂ حجۃ الوداع

اس ضمن میں نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ امت کی اصلاح و رہنمائی کیلئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۂ حجۃ الوداع درج کر دیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ہی اہتمام فرمایا تھا کہ حضور کی زندگی کے اس آخری حج اور آخری خطاب میں نہ صرف رشتہ دار اور لواحقین، بلکہ دور و نزدیک کے تمام مسلمان جمع ہو جائیں، تاکہ قرآن حکیم اور شریعت اسلامیہ کے اہم ترین اغراض و مقاصد ان پر واضح کر دیئے جائیں، اور اس طرح بیت اللہ جیسے مرکز توحید میں آخری بار سامعین پر اتمام حجت بھی ہو جائے لہذا ذیل کا خطبہ ہر مسلمان کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے:۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد خطبہ حج کا پہلا ولولہ انگیز فقرہ یہ تھا:۔

اے لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں اور تم اس اجتماع

میں کبھی دوبارہ جمع نہیں ہوں گے!"

اس ارشاد سے اجتماع کی غرض وغایت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آگئی، اور جس شخص نے بھی یہ ارشادِ مبارک سنا تڑپ کر رہ گیا اب آپ اصل پیغام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:۔

"اے لوگو! تمہارا خون، تمہارا مال، اور تمہارا ننگ وناموس اسیطرح ایک دوسرے پر حرام ہے، جس طرح یہ دن (جمعہ) یہ مہینہ (ذی الحج) یہ شہر (مکہ مکرمہ) تم سب کے لئے قابلِ حرمت ہے!

"اے لوگو! آخر تمہیں بارگاہ ایزدی میں پیش ہونا ہے۔ وہاں تمہارے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ متاعِ دنیا یا منصب واقتدار کی ہوس میں ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنا شروع کر دو!"

"اے لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اپنے اللہ سے ڈرتے رہنا تم نے ان کو نامِ خدا کی ذمہ داری سے اپنی زوجیت میں قبول کیا ہے، اور اللہ کا نام لے کر ان کا جسم اپنے لئے حلال بنایا ہے۔ عورتوں پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ غیر کو تمہارے بستر پر نہ آنے دیں۔ اگر وہ ایسا کریں، تو تم انہیں ایسی مار مارو جو نمایاں نہ ہو۔ اور عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ انہیں بافراغت کھانا کھلاؤ اور بافراغت کپڑا پہناؤ!"

"اے لوگو! اپنے غلاموں کے حقوق کا خاص خیال رکھو۔ جو خود کھاؤ گے وہی انہیں کھلانا، جو خود پہنو گے وہی انہیں پہنانا!

"اے لوگو! آج میں جاہلیت کے تمام قواعد رسوم کو اپنے قدموں سے پامال کرتا ہوں۔ میں عہد جاہلیت کے قتلوں کے جھگڑے ملیامیٹ کرتا ہوں، اور سب سے پہلے خود اپنے خاندانی مقتول ربیعہ بن حارث کے خون سے، جس کو ہذیل نے قتل کیا تھا، دست بردار ہوتا ہوں۔ میں زمانہ جاہلیت کے تمام سودی مطالبات بھی باطل قرار دیتا ہوں، اور سب سے پہلے خود اپنے خاندانی سود یعنے عباس بن عبدالمطلب کے سود سے دست بردار ہوتا ہوں!"

"اے لوگو! اب اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حقدار کا حق مقرر کر دیا ہے۔ لہٰذا کسی کو اپنے وارثوں کے حق میں وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے بچہ جس کے بستر پہ پیدا ہو، اسی کو دیا جائے، اور زنا کاروں کے لئے سنگسار ہے، اور ان کی جوابدہی اللہ پر ہے۔ جو لڑکا اپنے باپ کے سوا کسی دوسرے نسب کا دعویٰ کرے، اور غلام اپنے آقا کے سوا کسی اور طرف اپنی نسبت کرے ان پہ خدا کی لعنت ہے۔ عورت شوہر کے بلا اجازت اس کا مال صرف نہ کرے۔ قرض ادا کئے جائیں، عاریت[1] واپس کی جائے عطیات[2] لوٹائے جائیں، اور ضامن تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار ہے!

---

[1] کسی سے عارضی طور پہ استعمال کرنے کے لیے حاصل کی ہوئی چیز [2] یہاں عطیات واپس کرنے کا مفہوم و مقصد یہ ہے کہ احسان و کرم کا بدلہ احسان و کرم ہے۔ خواہ وہ کسی دوسری صورت میں ہو۔

"اے لوگو! تم سب کا معبود بھی ایک ہی ہے، اور تم سب کا باپ (آدمؑ) بھی ایک ہے۔ لہٰذا کسی عربی کو عجمی پر، کسی سرخ کو سیاہ پر، اور کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی پیدائشی فضیلت و برتری حاصل نہیں۔ ہاں صاحب فضیلت وہی ہے جو تقویٰ (پرہیزگاری) میں دوسروں پر فضیلت رکھتا ہو۔[1] ہر مسلمان دوسرے کا بھائی ہے، اور دنیا کے تمام مسلمان ایک برادری میں

■ اے لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا[2] تو تم کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ چیز اللہ تعالیٰ کی کتاب مقدس قرآن ہے!"

"اے لوگو! میرے بعد نہ کوئی نبی ہے[3]، اور نہ میرے بعد کوئی نئی امت ہے۔ پس تم سب حسب احکام قرآنی اللہ تعالیٰ عبادت کرو۔ نماز پنجگانہ کی پابندی کرو، رمضان کے روزے رکھو خوش دلی سے اپنے مالوں کی زکوٰۃ نکالو، اللہ کے گھر کا حج کرو، حکام امت کے احکام مانو، اور اپنے اللہ کی جنت میں جگہ حاصل کر لو!"

خطبہ کے آخر میں آپ نے حاضرین سے استفسار فرمایا:۔

■ اے (کل) اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے میرے متعلق گواہی طلب کریگا۔

---

[1] یہ ترجمانی ہے اس آیہ شریفہ کی اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (پ۲۶، ع۱۴) [2] یعنی اگر تم قرآن میں مذکورہ اوامر و نواہی پر اخلاص سے عمل پیرا رہے۔ [3] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اعلان ختم نبوت کا ایک واضح ثبوت ہے۔

تم اس وقت کیا جواب دو گے؟"

اس پر مجمع عام سے پُرجوش صدائیں بلند ہوئیں :۔

"اے اللہ کے رسول! آپ نے تمام احکامِ الٰہی ہم تک پہنچا دیئے۔ اے اللہ کے رسول! آپ نے فرضِ رسالت کما حقہٗ ادا کر دیا۔ اے اللہ کے رسول! آپ نے کھرے کھوٹے کو الگ کر دکھایا، مسلمانوں کی خیر خواہی کا حق ادا کر دیا۔"

اس وقت حضور سرورِ عالم کی انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھی۔ ایک دفعہ آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے تھے اور دوسری دفعہ مجمع کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے کہتے جاتے تھے :۔

"اے اللہ! خلقِ خدا کی گواہی سن لے۔ اے اللہ! خلقِ خدا کا اعتراف سن لے۔ اے اللہ! ان لوگوں کی گواہی پہ گواہ رہ۔"

اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

"جو لوگ موجود ہیں، وہ ان لوگوں تک جو موجود نہیں ہیں، میری تعلیمات اور نصائح پہنچاتے رہیں۔ تاکہ جو لوگ موجود نہیں ہیں ان پر بھی اتمامِ حجت ہو جائے، اور وہ غیر موجودگی کے عذر سے حضورِ حق تعالیٰ لاعلمی کا اظہار نہ کریں!"

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

وفاتِ صدّیق

حضرتِ ابوبکر صدیق رضؓ کے فضائل کوئی گنوائے بھی تو کہاں تک گنوائے اور ان کی فضیلت و عظمت کے لئے کیا رسولِ اکرمؐ کا یہ ارشاد ہی کافی نہیں کہ "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو ابوبکر صدیقؓ ہوتا۔" اور آپ کی یہ شان اس لئے بھی قابلِ قبول ہے کہ پیغمبر کے بعد دوسرا رتبہ صدیق ہی کا ہے۔ شرعی اصطلاح میں "صدیق" سے مراد ہے ایک ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات، صداقتِ پیغمبر، کتاب اللہ، حشر و نشر اور جزا و سزا پر مستقل اور غیر متزلزل یقین و ایمان رکھتا ہو، اور بذاتِ خود یُؤمِنُونَ بِالغَیبِ[1] کی عملی تفسیر ہو۔ چنانچہ صدیقِ اکبرؓ میں یہ صفات بدرجہ اتم موجود تھیں۔ تمام مذکورہ چیزوں پر تو وہ ایمان محکم رکھتے ہی تھے لیکن چونکہ واقعہ معراج کی ایک جداگانہ

---

[1] "سچے مومن تمام ایمانات پر غائبانہ ایمان رکھتے ہیں۔" (البقرۃ ۱:ع۱)

حیثیت تھی، الہٰذا کفار نے اس خرقِ عادت کا فائدہ یوں اٹھایا کہ اس کے ذریعے سب سے پہلے آپ کے ایمان کو متزلزل کرنا چاہا، اور بولے "ابوبکر، تیرا نبی بہکی بہکی باتیں کہنے لگا ہے اور کہتا ہے کہ میں راتوں رات ہفت افلاک اور جنت و دوزخ کی سیر کر آیا ہوں۔ کیا خیال ہے تیرا؟" آپ نے فرمایا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے ہیں، بالکل درست ہے۔ میں ان کے مشاہدات واطلاعات پر نادیدہ ایمان رکھتا ہوں۔"

الغرض ایمان بالغیب اور یقین محکم کا یہی مقام بلند ہے جو انہیں سب پر امتیاز بخشتا ہے۔ اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے آپ کی قربانیاں بے مثل ہیں۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامِ دین کے لئے مالی امداد چاہی تو یہ سبھی کچھ اٹھا لائے۔ پوچھا گیا کہ اپنے اہل وعیال کے لئے بھی کچھ رکھا یا نہیں، تو فرمایا "ان کے لئے اللہ اور اس کا رسول کافی ہیں۔"

پروانے کو چراغ ہے، بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسولؐ بس (اقبال)

مزید برآں آپ کی ایک بہت بڑی سعادت وخوش نصیبی یہ ہے کہ آپ کی دخترِ نیک اختر (عائشہ صدیقہؓ) امام الانبیاء کی زوجہ تھیں، اور ان سے احادیث نبوی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ مروی ہے جسے سیرت نبوی کا اہم مخزن کہنا چاہیئے۔ اب اسی صدیقِ اکبرؓ کے ایام کا عکس ملاحظہ فرمایئے جس نے اپنا تن، من، دھن، ملتِ بیضا کے فروغ وارتقاء کے لئے وقف کر رکھا تھا۔

ابن شہاب فرماتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس ہدیہ میں گوشت آیا

تھا۔ آپ حارث بن کلاہ کے ساتھ اس کو تناول فرما رہے تھے، کہ حارث نے کہا۔ "یا امیر المومنین! آپ نہ کھائیں مجھے اس میں زہر کی آمیزش کا اشتباہ ہو رہا ہے۔" آپ نے ہاتھ کھینچ لیا، مگر اسی روز سے دونوں صاحب مضمحل رہنے لگے۔

۷ جمادی الآخر دوشنبہ ۱۳ ہجری کو آپ نے غسل فرمایا تھا۔ اسی روز سردی سے بخار ہو گیا، اور پھر نہیں سنبھلے۔ جب تک جسم پاک میں توانائی باقی تھی مسجد نبوی میں تشریف لاتے رہے اور نماز پڑھاتے رہے۔ لیکن جب مرض نے غلبہ پا لیا تو حضرت عمرؓ کو بلا کر ارشاد فرمایا "آئندہ آپ نماز پڑھایا کریں۔" بعض صحابہؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا۔ "اگر آپ اجازت دیں تو ہم کسی طبیب کو بلا کر آپ کو دکھائیں" فرمایا "طبیب نے مجھے دیکھ لیا ہے۔" وہ پوچھنے لگے "اس نے کیا کہا ہے؟" آپ نے فرمایا اِنِّی فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ وہ کہتا ہے "میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔"

جب طبیعت زیادہ کمزور و مضمحل ہو گئی تو آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین کی فکر ہوئی۔ آپ چاہتے تھے کہ مسلمان کسی طرح فتنۂ اختلاف و نفاق سے محفوظ و مامون رہیں، لہٰذا فیصلہ کیا کہ اہل الرائے صحابہ کے مشورہ سے خود ہی نامزد کر دیں پہلے آپ نے عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو بلایا اور پوچھا "عمر کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟" انہوں نے عرض کیا "آپ ان کی نسبت جتنی بھی اچھی رائے قائم کر لیں میرے نزدیک وہ اس سے بھی بہتر ہیں۔ ہاں، ان میں کسی قدر تشدد ضرور ہے۔" حضرت صدیقؓ نے جواب میں فرمایا "ان کی سختی اس لئے تھی کہ میں نرم تھا۔ جب ان پر ذمہ داری پڑ جائے گی تو وہ از خود نرم ہو جائیں گے۔" حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف رخصت ہو گئے تو حضرت عثمانؓ کو طلب فرمایا اور رائے دریافت کی۔ حضرت عثمانؓ نے

عرض کیا "آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں" فرمایا پھر بھی آپ کی کیا رائے ہے؟
عرض کیا "میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ عمرؓ کا باطن ظاہر سے اچھا ہے، اور ان کی
مثل ہم لوگوں میں کوئی نہیں" اسی طرح حضرت سعیدؓ بن زید اور اسیدؓ بن حضیر سے
بھی استفسار فرمایا۔ حضرت اسیدؓ نے کہا "عمر کا باطن پاک ہے۔ وہ نکوکاروں
کے دوست اور بدوں کے دشمن ہیں۔ مجھے خدمت اسلام کے لئے ان سے زیادہ
قوی اور مستعد شخص نظر نہیں آتا۔"

وصیت نامہ:۔

تکمیل مشورت کے بعد آپ نے حضرت عثمانؓ کو طلب کیا اور فرمایا: "عہد نامہ
خلافت لکھئے۔" ابھی چند سطور لکھی گئی تھیں کہ آپ کو غش آگیا۔ حضرت عثمانؓ نے
یہ کیفیت دیکھ کر یہ الفاظ اپنی طرف سے لکھ دیئے کہ "میں عمرؓ کو خلیفہ مقرر کرتا ہوں۔"
تھوڑی دیر کے بعد ہوش آیا تو حضرت عثمانؓ سے فرمایا "جو کچھ لکھا ہے مجھے پڑھ
کر سناؤ" حضرت عثمانؓ نے ساری عبارت پڑھ دی تو بے ساختہ اللہ اکبر پکار اٹھے
اور کہا "خدائے تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے۔" جب وصیت نامہ تیار ہو گیا
تو حضرت عثمانؓ اور ایک انصاری کے ہاتھ مسجد نبوی میں بھیج دیا تاکہ مسلمانوں کو
سنا دیں اور خود بھی بالاخانے پر تشریف لے گئے۔ شدت ضعف کے باعث اپنے
قدموں پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے لہٰذا ان کی دختر نیک اختر حضرت اسماءؓ دونوں ہاتھوں سے
سنبھالے ہوئے تھیں نیچے آدمی جمع تھے۔ انہیں مخاطب کر کے فرمایا:۔
"کیا تم اس شخص کو قبول کرو گے جسے میں تم پر خلیفہ مقرر کروں؟ خدا کی قسم!

میں نے غور و فکر میں ذرا برابر کمی نہیں کی۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے کسی قریب ترین عزیز کو بھی تجویز نہیں کیا۔ میں عمرؓ بن خطاب کو اپنا جانشین مقرر کرتا ہوں۔ جو کچھ میں نے کیا ہے اسے تسلیم کر لو۔"

وصیت نامہ کے الفاظ یہ تھے :۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ یہ ابوبکرؓ بن ابو قحافہ کا وصیت نامہ ہے، جو اس نے آخری وقت دنیا میں، جبکہ وہ اس جہاں سے کوچ کر رہا ہے، اور شروع وقت آخرت میں جبکہ وہ عالم بالا میں داخل ہو رہا ہے، قلمبند کرایا ہے۔ یہ ایسے وقت کی نصیحت ہے جس وقت کافر ایمان لے آتے ہیں، بدکار سنبھل جاتے ہیں، جھوٹے حق کے روبرو گردن جھکا دیتے ہیں۔ میں نے اپنے بعد عمر بن خطاب کو تم پر امیر مقرر کیا ہے، اللہٰذا تم ان کا حکم سننا اور اطاعت کرنا۔ میں نے اس معاملے میں خدا کی، رسول کی، اسلام کی، خود اپنی، اور آپ لوگوں کی خدمت و بہبود کا پورا لحاظ رکھا ہے، اور کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اب اگر عمرؓ عدل کریں گے تو ان کے متعلق میرا علم اور حسنِ ظن یہی ہے۔ اگر وہ بدل جائیں تو ہر شخص اپنے کئے کا جوابدہ ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے، نیک نیتی سے کیا ہے، اور غیب کا علم سوائے خدا کے اور کسی کو نہیں ہے۔ جو لوگ ظلم کریں گے، وہ اپنا انجام جلد دیکھ لیں گے۔ والسلام و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ۔"

اس کے بعد آپ نے حضرت عمرؓ کو خلوت میں بلایا، اور مناسب وصیتیں کیں۔ پھر ان کے لئے بارگاہِ خداوندی میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا :۔

خداوندا! میں نے یہ انتخاب اس لئے کیا ہے کہ مسلمانوں کی بھلائی ہو۔ مجھے

یہ خوف تھا کہ وہ کہیں فتنہ نفاق و فساد میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ میرے مالک! جو کچھ میں نے کیا ہے تو اسے بہتر جانتا ہے۔ میرے غور و فکر نے یہی رائے قائم کی تھی اور اس میں نے ایک ایسے شخص کو والی مقرر کیا ہے جو میرے نزدیک سب سے زیادہ مستقل مزاج ہے، اور سب سے زیادہ مسلمانوں کی بھلائی کا آرزومند ہے۔ اے اللہ! میں تیرے حکم سے اس دنیائے فانی کو چھوڑتا ہوں۔ اب تیرے بندے تیرے حوالے۔ وہ سب تیرے بندے ہیں، ان کی باگ تیرے ہاتھ میں ہے۔ یا اللہ مسلمانوں کو صالح حاکم عنایت فرما، اور عمرؓ کو خلفائے راشدین کی صف میں جگہ عطا کر، اور اس کی رعیت کو صلاحیت سے بہرہ مند فرما۔"

یہ حضرت صدیق اکبرؓ کی ولایت و قبولیت کا اعجاز تھا کہ اس قدر الم کٹھن اور پیچیدہ معاملہ اس قدر سہولت اور خوش اسلوبی سے طے ہو گیا۔ پہلے اور پچھلے مسلمانوں کا یہ فتویٰ ہے کہ خلافت پر عمر فاروقؓ کا تقرر حضرت صدیق اکبرؓ کا اسلام اور امت مسلمہ پر اتنا بڑا احسان ہے کہ قیامت تک اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے چند سالوں میں جو کچھ کیا اس کی صحیح حیثیت یہ ہے کہ اسلام کی طاقت فرشِ زمین پہ بکھری پڑی تھی، آپ نے اسے یکجا کر کے بایں طور منظم و مستحکم کیا کہ عرشِ اعظم تک پہنچا دیا۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے غابہ کی ۲۰ وسق کھجوریں مجھے ہبہ کر دی تھیں۔ جب مرض کا غلبہ ہونے لگا تو ارشاد فرمایا: "بیٹی! میں تمہیں ہر حال میں خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہارے افلاس سے مجھے دکھ ہوتا ہے اور تمہاری خوش حالی سے مجھے راحت ملتی ہے۔ غابہ کی جو کھجوریں میں نے ہبہ

کی تھیں اگر تم نے ان پر قبضہ کر لیا ہو تو خیر، ورنہ میری موت کے بعد وہ کھجوریں میرا ترکہ ہوں گی۔ تمہارے دوسرے دو بہن بھائی ہیں۔ ان کھجوروں کو از روئے قرآن ان سب میں تقسیم کر دینا۔ حضرت صدیقہؓ نے فرمایا "اے بزرگ باپ! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔ اگر اس سے بہت زیادہ مال بھی ہوتا تو میں اسے آپ کے ارشاد خوشنودی پر پہلے سے چھوڑ دیتی۔"

وفات سے کچھ عرصہ پہلے ارشاد فرمایا "بیت المال کے وظیفہ کا حساب کیا جائے اور بتایا جائے کہ میں نے آج تک کیا وصول کیا ہے۔ حساب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کل چھ ہزار درہم ادا کئے گئے ہیں۔ ارشاد فرمایا "میری زمین فروخت کر کے یہ تمام رقم ادا کر دی جائے۔ اسی وقت زمین فروخت کی گئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یارِ غار کے ایک ایک بال کو بیت المال کے بار سے سبکدوش کر دیا گیا۔ جب یہ ادائیگی ہو چکی تو ارشاد فرمایا تحقیقات کی جائے کہ خلافت قبول کرنے کے بعد میرے مال میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔" معلوم ہوا کہ پہلا اضافہ ایک حبشی غلام کا ہے جو بچوں کو کھلاتا ہے اور مسلمانوں کی تلواروں کو صیقل بھی کرتا ہے۔ دوسرا اضافہ ایک اونٹنی ہے جس پر پانی لایا جاتا ہے تیسرا اضافہ ایک سوا روپے کی چادر ہے۔ ارشاد فرمایا کہ میری وفات کے بعد یہ تینوں چیزیں خلیفہ وقت کے پاس پہنچا دی جائیں۔

رحلت مبارک کے بعد جب یہ سامان امیر المؤمنین حضرت فاروقؓ کے سامنے لایا گیا تو آپ رو پڑے اور فرمایا "اے ابوبکرؓ! تم اپنے جانشینوں کے واسطے کام بہت دشوار کر گئے ہو۔"

حضرت صدیق اکبر کی حیاتِ پاک کا آخری دن تھا کہ حضرت مثنیٰ نائب سپہ سالار

عراق آپہنچے۔ اس وقت حضرت امیر المومنین جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے۔ مثنیٰ کی آمد معلوم ہوئی تو کسی خطرے کا احساس کر کے انہیں اسی وقت بلا بھیجا انہوں نے محاذِ جنگ کے تمام حالات تفصیل سے بیان کئے اور کہا کہ کسریٰ نے اپنی تازہ دم فوجیں محاذِ عراق پر بھیج دی ہیں۔ حالات سن کر آپ نے اسی وقت حضرت عمر فاروق کو طلب کیا اور فرمایا "عمرؓ! جو کچھ میں کہتا ہوں اسے سنو اور اس پر عمل کرو۔ مجھے امید ہے کہ آج میری زندگی ختم ہو جائے گی۔ اگر دن میں میرا دم نکلے تو شام سے پہلے، اور اگر رات میں نکلے تو صبح سے پہلے مثنیٰ کے لئے کمک بھیج دینا عمرؓ! کسی بھی مصیبت کی وجہ سے دینِ اسلام کی خدمت اور حکمِ ربانی کی تعمیل کو کل پر ملتوی نہ کرنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے بڑھ کر ہمارے لئے اور کونسی مصیبت ہو سکتی تھی۔ مگر تم نے دیکھا اس روز جو کچھ میں نے کرنا تھا میں نے کر دیا۔ خدا کی قسم! اگر میں اس روز حکمِ خداوندی کی تعمیل سے غافل ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ ہم پر تباہی کی سزا مسلط کر دیتا۔ اور مدینہ کے گوشے گوشے میں فساد کی آگ بھڑک اٹھتی۔ اگر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو شام میں کامیابی عطا فرمائے تو پھر خالد کی فوجوں کو عراق کے محاذ پر بھیج دینا اس لئے کہ وہ آزمودہ کار بھی ہیں، اور عراق کے حالات سے باخبر بھی ہیں۔"

انتقال کے روز دریافت فرمایا "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کس روز رحلت فرمائی تھی؟" حاضرین نے کہا "دوشنبہ کے روز" ارشاد فرمایا: "تو میری آرزو بھی یہی ہے کہ میں آج رخصت ہو جاؤں۔ اگر اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دے تو میری قبر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مبارک کے پاس بنائی جائے۔" اب وفات کا وقت قریب آ رہا تھا حضرت عائشہ صدیقہؓ سے دریافت فرمایا "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کو کتنے کپڑوں کا کفن دیا گیا تھا؟" عرض کیا "تین کپڑوں کا" ارشاد فرمایا: میرے کفن میں بھی تین کپڑے ہوں۔ یہ دو چادریں جو میرے بدن پر ہیں دھولی جائیں اور ایک کپڑا بنالیا جائے۔" یہ سن کر حضرت صدیقہؓ نے دردمندانہ فرمایا! اباجان! ہم اس قدر غریب نہیں ہیں کہ آپ کے لئے نیا کفن بھی نہ خرید سکیں۔" ارشاد فرمایا: "بیٹی نئے کپڑے کی مُردوں کی نسبت زندوں کو زیادہ ضرورت ہے۔ میرے لئے یہی پھٹا پرانا ٹھیک ہے۔"

موت کی ساعتیں لحہ بہ لحہ قریب آرہی تھیں۔ حضرت عائشہ نے فرطِ رنج والم میں ایک شعر پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے:۔

"بہت سی نورانی صورتیں ہیں جن سے بادل بھی پانی مانگتے تھے۔ وہ یتیموں کے فریاد رس تھے، اور بیواؤں کے پشت پناہ تھے۔"

یہ سن کر حضرت صدیقؓ نے آنکھیں کھول دیں اور فرمایا، میری بیٹی! یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تھی!

حضرت عائشہؓ نے دوسرا شعر پڑھا:۔

"قسم ہے تیری عمر کی جب موت کی ہچکی لگ جاتی ہے تو پھر کوئی زر و مال کام نہیں دیتا۔"

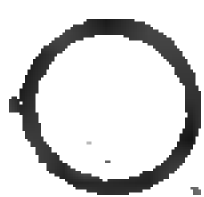
یہ سن کر ارشاد فرمایا یوں نہیں، بلکہ اس طرح کہو: جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (آیۃ شریفہ) یعنی موت کی بیہوشی کا وقت آگیا یہ وہی وقت ہے جس سے تم بھاگتے تھے۔"

آپ کی حیاتِ پاک کا خاتمہ اس کلام پر ہوا: رَبِّ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۔ اے اللہ! مجھے سچا مسلمان ہونے کی حالت میں مار، اور

اپنے نیک بندوں میں شامل کرے۔

جب روحِ اقدس نے پرواز کی تو ۲۲ جمادی الآخر سنہ ۱۳ھ کی تاریخ تھی منگل کا دن تھا۔ عشاء اور مغرب کا درمیانی وقت۔ عمر شریف ۶۳ سال تھی۔ ایامِ خلافت دو برس تین مہینے اور گیارہ دن۔ آپ کی زوجہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیس نے غسل دیا۔ حضرت عبدالرحمان بن ابوبکر جسمِ اطہر پر پانی بہاتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرقد مبارک کے ساتھ قبر شریف اس طرح کھودی گئی تھی کہ آپ کا سر مبارک حضرت رحمۃ للعالمینؐ کے دوش پاک کے ساتھ ہے اور قبروں کے تعویز برابر برابر آجائیں۔ حضرت عمرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ نے میت پاک کو لحد میں اتارا، اور ایک ایسی برگزیدہ شخصیت کو جو رسول دوجہاںؐ کے بعد امتِ مسلمہ کی سب سے زیادہ مقبول محبوب، بزرگوار اور متقی شخصیت تھی ہمیشہ کے لئے چشمِ جہاں سے اوجھل کر دیا۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ○



شہادتِ فاروق
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مشیت الٰہی کی کرشمہ سازیاں دیکھو کہ جو شخص زمانہ کفر میں اسلام اور مسلمانوں کا سب سے زیادہ دشمن تھا، اور انہیں قطعی نیست و نابود کرنا چاہتا تھا، وہ شخص جب داعی اسلام کو قتل کرنے کے لئے نکلتا ہے، تو خود مقتولِ حق و صداقت ہو کر بے اختیار ان کے قدموں میں گر پڑتا ہے، اور قبول اسلام کے بعد ملتِ بیضا کے فروغ و ارتقاء اور نشر و اشاعت اسلام میں وہ عدیم المثال خدمات انجام دیتا ہے کہ تمام صحابہ کے لئے باعث رشک بن جاتی ہیں!

جب نبی الرحمت نے حضرت عمرؓ کو فاروق کا لقب عطا فرمایا تھا تو اس کا مطلب مقصد ہی یہ تھا کہ آپ نے قبول اسلام کے بعد حق و باطل کے درمیان عملی طور پر ایک فرقِ عظیم پیدا کر دیا، اور خیر و شر کو ایک واضح امتیاز بخشا۔ اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ اَلحَقُّ یَنطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرؓ یعنے

"وحی تعالیٰ عمر فاروقؓ کی زبان سے بولتا ہے۔" اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ بار بار وحی حضرت عمرؓ کی تجاویز و آرا کی تائید میں نازل ہوئی۔ اس صاحب جلال و جبروت ہستی کے رعب و ہیبت کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس راستے سے عمرؓ گذرتا ہے، اس راستے سے شیطان فوراً بھاگ جاتا ہے۔"

علاوہ ازیں عہد فاروقی عدل و مساوات اور اسلامی جمہوریت کا نہایت مکمل اور عظیم ترین نمونہ تھا۔ آزادی رائے اور آزادیٔ تنقید و احتساب کی یہ کیفیت تھی کہ ایک بڑھیا اور ایک معمولی بدوی بھی جرأت و بے باکی سے فاروق اعظمؓ کے قول و فعل پر معترض ہوتے تھے، اور پھر ان سے کسی آمرانہ جبر و قہر کا پتہ تک دیکھے بغیر ان کا اطمینان بھی کر دیا جاتا تھا۔ خدمتِ خلق اور اعانتِ مساکین کا جذبہ آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جس کے تحت سامان خورد و نوش اپنی پیٹھ پر لاد لاد کر بیوگان و یتامیٰ کے گھر پہنچاتے تھے اور قحط کے ایام میں اس فکر و تشویش سے روتے روتے رخساروں میں گڑھے پڑ گئے کہ روزِ قیامت حضورِ حق رعایا کے متعلق پرسش ہو گی۔ امیر المومنین سفر بیت المقدس اختیار کرتے ہیں تو غلام سے تقاضا کرتے ہیں کہ وہ اونٹ پر باری باری سوار ہو۔ الغرض خدمتِ خلق، عدل و مساوات، اور صحیح اسلامی جمہوریت کے قیام و انصرام میں آج تک آپ کی مثال پیدا نہ ہو سکی۔ آپ کے اکثر ہم عصر لوگوں کو بھی یہ شکایت تھی کہ آپ کے مزاج میں قہر و جلال اور شدت و جبروت بہت زیادہ ہے اور بات بات پر آپ کی تیغ بے نیام ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ کا قہر و جلال ذاتی اغراض و مفادات کے لیے تھا، یا غیرتِ حق کے تحت اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے

تاریخی حقائق کے تحت اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ[۱] کے مصداق آپ کی جانب سے کسی کے لئے محبت و شفقت تھی تو خالصتاً رضائے الٰہی کے لئے، اور اگر آپ کسی پر جبر و تشدد برتتے تھے، تو وہ بھی صرف رضائے الٰہی کے لئے آپ ہمہ تن ان تمام خبیث و شر انگیز عناصر کی بیخ کنی پر تلے رہے تھے جو کسی نہ کسی طرح اسلام اور مسلمانوں کو ضعف پہنچاتے ہوں یا کتاب اللہ کی غلط تاویلات سے عوام الناس کو گمراہ کرتے ہوں۔

سیرت فاروقی کے اس مجمل سے تذکرہ کے بعد آپ کی زندگی کے آخری ایام کی کیفیت ملاحظہ ہو:

۲۳ھ میں کرمان، سجستان، مکران اور اصفہان کے علاقے فتح ہوئے گویا سلطنت اسلامی کی حدود مصر سے بلوچستان تک وسیع ہو گئیں۔ اسی سال آپ نے آخری حج فرمایا۔ حج سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ راہ میں ایک مقام پر ٹھہر گئے اور بہت سی کنکریاں جمع کر کے ان پر چادر بچھائی، پھر چیت لیٹ کر آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور دعا کرنے لگے:

"خداوندا! اب میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، میرے قویٰ کمزور ہو گئے ہیں، اور میری رعایا ہر جگہ پھیل گئی ہے۔ اب تو مجھے اس حالت میں اٹھا لے کہ میرے اعمال برباد نہ ہوں، اور میری عمر کا پیمانہ اعتدال سے متجاوز نہ ہو۔"

ایک دن کعب بن احبار نے کہا "میں توراۃ میں دیکھتا ہوں کہ آپ شہید ہو نگے

۱؎ یعنی "مومن کی محبت اور عداوت صرف رضائے الٰہی کے لئے ہوا کرتی ہے۔"

آپ نے فرمایا: "یہ کیسے ممکن ہے کہ عرب میں رہتے ہوئے شہید ہو جاؤں؟" پھر دعا فرمائی: "اے خداوند! مجھے اپنے راستے میں شہادت عطا فرما، اور اپنے محبوب نبی کے مدینہ کی حدود کے اندر پیغام اجل ارزانی فرما۔"

ایک دفعہ خطبہ جمعہ میں آپ نے ارشاد فرمایا: "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ ایک مرغ آیا ہے اور مجھ پر ٹھونگیں مار رہا ہے۔ اس کی تعبیر یہی ہو سکتی ہے کہ اب میری موت کا زمانہ قریب آ گیا ہے۔ میری قوم مطالبہ کر رہی ہے کہ میں اپنا جانشین مقرر کر دوں۔ یاد رکھو کہ میں نہ تو موت کا مالک ہوں نہ دین و خلافت کا۔ اللہ تعالیٰ اپنے دین اور خلافت کا خود محافظ ہے۔ وہ انہیں کبھی نہیں ضائع کریگا۔"

زہری کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ کوئی مشرک جو بالغ ہو، مدینہ منورہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلہ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ گورنر کوفہ نے آپ کو لکھا کہ "یہاں کوفہ میں فیروز نامی ایک بہت ہوشیار نوجوان ہے، اور وہ نقاشی، نجاری اور آہن گری میں بڑی مہارت رکھتا ہے اگر آپ اسے مدینہ میں داخلے کی اجازت دیں تو وہ مسلمانوں کے بہت کام آئے گا۔" حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس کو بھیج دیا جائے۔ فیروز نے مدینہ پہنچ کر شکایت کی کہ "مغیرہ بن شعبہ نے مجھ پر بہت زیادہ ٹیکس لگا رکھا ہے۔ آپ اس میں تخفیف کرا دیں۔" حضرت عمرؓ نے پوچھا: "کتنا ٹیکس ہے؟" فیروز نے جواب دیا "دو درہم روزانہ دس سات آنے" حضرت عمرؓ نے دریافت کیا "تمہارا پیشہ کیا ہے؟" فیروز نے کہا "نجاری، نقاشی اور آہن گری" حضرت عمرؓ نے فرمایا "ان صنعتوں کے مقابلہ میں یہ رقم زیادہ نہیں ہے" فیروز کے لئے یہ جواب ناقابل برداشت تھا لہٰذا وہ بغض و عناد سے لبریز چلا گیا۔ وہ کہتا تھا کہ امیر المومنین میرے سوا ہر شخص

سے انصاف کرتے ہیں "

چند روز کے بعد حضرت عمرؓ نے اُسے پھر یاد فرمایا اور پوچھا "میں نے سنا ہے کہ تم ایک چکی تیار کر سکتے ہو جو ہوا سے چلے۔ فیروز نے ترشروئی سے جواب دیا کہ "میں تمہارے لئے ایک ایسی چکی تیار کروں گا جسے یہاں کے لوگ کبھی نہیں بھولیں گے"۔ فیروز رخصت ہو گیا تو آپ نے فرمایا "یہ شخص مجھے قتل کی دھمکی دے گیا ہے"۔ چنانچہ وہ دوسرے روز ایک دو دھارا خنجر جس کا قبضہ وسط میں تھا، آستین میں چھپائے ہوئے صبح سویرے مسجد کے گوشے میں آ بیٹھا۔ مسجد میں کچھ لوگ صفیں سیدھی کرنے پر مقرر تھے جب وہ صفیں سیدھی کر لیتے تھے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لاتے اور امامت کراتے تھے۔ اس روز بھی اسی طرح ہوا جب صفیں سیدھی ہو چکیں تو حضرت عمرؓ امامت کے لئے آگے بڑھے اور جونہی نماز شروع کی، فیروز نے دفعتاً گھات میں سے نکل کر چھ وار کئے جن میں ایک ناف کے نیچے پڑا۔ دنیا نے اس دردناک حالت میں بھی خدا پرستی کا ایک عجیب نظارہ دیکھا۔ اس وقت جب حضرت عمرؓ اپنے قدموں پر گر رہے تھے، آپ نے حضرت عبدالرحمان بن عوف کا ہاتھ پکڑ کر اپنی جگہ پر کھڑا کر دیا، اور بخود زخموں کے صدمے سے زمین پر گر پڑے۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف نے اس حالت میں نماز پڑھائی کہ امیرالمومنین حضرت فاروق اعظمؓ سامنے پڑے تڑپ رہے تھے۔ فیروز نے راہ گریز اختیار کرتے ہوئے بعض اور لوگوں کو بھی زخمی کیا، لیکن آخر وہ پکڑا گیا، اور اسی وقت اس نے خودکشی کر لی۔ بعدازاں حضرت عمرؓ کو اٹھا کر گھر لایا گیا۔ آپ نے سب سے پہلے یہ دریافت فرمایا کہ میرا قاتل کون تھا؟ لوگوں نے عرض کیا فیروز۔ اس جواب سے چہرہ مبارک پر بشاشت ظاہر ہوئی،

اور فرمایا: "الحمد للہ کہ میں کسی مسلمان کے ہاتھ سے قتل نہیں ہوا" لوگوں کا خیال تھا کہ زخم چنداں کاری نہیں ہے، لہٰذا شفا ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک طبیب بلایا گیا۔ اس نے نبیذ اور دودھ پلایا، مگر یہ دونوں چیزیں زخم کی راہ سے باہر آگئیں۔ اس سے تمام مسلمانوں پر افسردگی اور مایوسی طاری ہو گئی، اور وہ سمجھے کہ اب حضرت عمرؓ جانبر نہ ہو سکیں گے۔

رنجیدہ و مضطرب مسلمان آپ کی عیادت کے لئے آتے تھے، اور بے اختیار آپ کی تعریفیں کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس آئے اور بے اختیار آپ کے فضائل و اوصاف بیان کرنے لگے۔ آپ نے ارشاد فرمایا: "اگر آج میرے پاس دنیا بھر کا سونا بھی موجود ہوتا تو میں اسے خوفِ قیامت سے رستگاری حاصل کرنے کے لئے قربان کر دیتا۔"

جب تک حضرت عمرؓ فاروق اعظمؓ مسلمانوں کی آنکھ کے سامنے تھے انہیں نئے انتخاب کا تصور تک نہیں ہوا۔ وہ یوں سمجھتے تھے کہ شاید اسلام کا یہ سب سے بڑا خادم یونہی عرصہ دراز تک امتِ رسول کی خدمت و حفاظت کرتا رہے گا۔ لیکن جب عمر فاروقؓ ناگہاں بستر پر پڑ گئے تو مسلمانوں کو پہلی دفعہ اپنی بے بسی اور اسلام کی تنہائی کا احساس ہوا۔ اب ہر مسلمان کو سب سے پہلی فکر یہی تھی کہ حضرت عمرؓ کے بعد اس امت کا محافظ کون ہوگا؟ جتنے بھی لوگ خبر گیری کے لئے آتے تھے، یہی عرض کرتے تھے: "امیر المومنین! آپ اپنا جانشین مقرر کرتے جائیے۔" آپ مسلمانوں کا یہ تقاضا سنتے تھے اور چپ ہو جاتے تھے۔ آخر ارشاد فرمایا: "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ بعد موت بھی یہ بوجھ میرے ہی کندھوں پر رہے؟ — یہ نہیں ہو سکتا۔ میری

آرزو صرف یہی ہے کہ میں اس مسئلہ سے اس طرح الگ ہو جاؤں کہ میرے عذاب و ثواب کے دونوں پلڑے برابر رہ جائیں"۔ حضرتِ فاروق اعظم نے انتخابِ خلافت کے مسئلہ پر مدتوں غور فرمایا تھا، اور وہ اکثر اس موضوع پر سوچا کرتے تھے۔ لوگوں نے متعدد مرتبہ ان کو اس حالت میں دیکھا تھا کہ سب سے الگ متفکر بیٹھے ہوئے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں۔ دریافت کیا جاتا تو ارشاد فرماتے: "میں خلافت کے معاملہ میں حیران ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کسے منتخب کروں"۔ بارہا غور و فکر کے بعد بھی ان کی نظر کسی ایک شخص پر جمتی نہیں تھی۔ بارہا ان کے منہ سے ایک بے ساختہ آہ نکل جاتی تھی، اور فرماتے تھے: "افسوس مجھے اس بار کا کوئی اٹھانے والا نظر نہیں آتا"۔

ایک شخص نے کہا: "آپ عبداللہؓ بن عمرؓ کو خلیفہ کیوں نہیں مقرر کر دیتے"۔ فرمایا "اے شخص! خدا تجھے غارت کرے۔ واللہ میں نے کبھی خدا سے استدعا نہیں کی کہ میرا بیٹا خلیفہ بن جائے۔ کیا میں ایک ایسے شخص کو خلیفہ بنا دوں جس میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کی بھی صحیح قابلیت موجود نہیں ہے؟"

اسی سلسلہ میں فرمایا "میں اپنے ساتھیوں کو خلافت کی حرص میں مبتلا دیکھ رہا ہوں ہاں اگر آج سالم مولیٰ، ابو حذیفہ، یا ابو عبیدہ بن جراح زندہ ہوتے تو میں اس کے متعلق کہہ سکتا تھا"۔ آپ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسی کو زیادہ پسند فرماتے تھے کہ انتخابِ خلیفہ کے مسئلہ کو چھیڑے بغیر اس دنیا کو عبور کر جائیں۔ لیکن مسلمانوں کا اصرار روز بروز بڑھتا چلا گیا۔ آخر آپ نے فرمایا کہ "میرے انتقال کے بعد عثمانؓ، علیؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن وقاص تین دن کے اندر جس شخص کو منتخب کر لیں، اسی کو خلیفہ مقرر کیا جائے"۔

آپ نے زندگی کے آخری لمحات میں اپنے صاحبزادے عبداللہ کو طلب فرمایا وہ حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا۔ وہ حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا "عبداللہ حساب کرو کہ مجھ پر قرض کتنا ہے؟" حساب لگا کر بتایا گیا کہ ۸۶ ہزار درہم۔ آپ نے فرمایا: "یہ قرض آل عمرؓ کے مال سے ادا کیا جائے۔ اگر ان میں استطاعت نہ ہو تو خاندان عدی سے امداد لی جائے۔ اگر پھر بھی ادا نہ ہو تو کل قریش سے لیا جائے۔ لیکن قریش کے علاوہ دوسروں کو تکلیف نہ دی جائے۔"

حضرت عمرؓ کے غلام نافع سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ پر قرض کیونکر رہ سکتا تھا جبکہ ان کے ایک وارث نے اپنا حصہ وراثت ایک لاکھ میں بیچا؟ دوسری روایت یہ ہے کہ حضرت عمرؓ کا مسکونہ مکان بیچ ڈالا گیا جس کو امیر معاویہ نے خریدا اور قرض ادا ہو گیا۔

تصفیہ قرض کے بعد بیٹے سے فرمایا: "تم ابھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے پاس جاؤ اور ان سے التماس کرو عمرؓ چاہتا ہے کہ اسے اپنے دو رفیقوں کے پاس دفن ہونے کی اجازت دی جائے۔" عبداللہ بن عمرؓ نے آپ کا یہ پیغام حضرت عائشہؓ صدیقہ کو پہنچایا۔ تو بے حد درد مند ہوئیں اور فرمایا میں نے یہ جگہ اپنے لئے محفوظ رکھی تھی مگر آج میں عمرؓ کو اپنی ذات پر ترجیح دیتی ہوں۔" جب بیٹے نے آپ کو حضرت عائشہ کی منظوری کی اطلاع دی تو بے حد خوش ہوئے اور اس آرزو کی قبولیت پر نہایت خلوص سے شکریہ ادا کیا۔

اب آپ کی درد و اذیت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا تھا۔ اسی حالت میں تمام حاضرین کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا: "جو شخص خلیفہ مقرر ہو وہ پانچ جماعتوں کے حقوق کا

خاص طور پر لحاظ رکھے۔ مہاجرین کا، انصار کا، اعراب کا۔ ان اہل عرب کا جو دوسرے شہروں میں جاکر آباد ہوئے ہیں، اور اہل ذمہ کا" پھر ہر جماعت کے حقوق کی تشریح فرمائی اور اہل ذمہ کے متعلق ارشاد فرمایا" میں خلیفۂ وقت کو وصیت کرتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے عائد کردہ ذمہ داریوں کا لحاظ رکھے، اور اہل ذمہ کے تمام معاہدات پورے کئے جائیں۔ ان کے دشمنوں سے لڑا جائے، اور انہیں طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دی جائے۔"

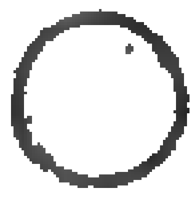
انتقال سے تھوڑا عرصہ پہلے اپنے بیٹے عبداللہؓ سے ارشاد فرمایا: "میرے کفن میں بے جا صرف نہ کرنا۔ اگر میں اللہ کے ہاں بہتر ہوں تو مجھے از خود بہتر لباس مل جائے گا۔ اگر بہتر نہیں ہوں، تو بہتر کفن بے فائدہ ہے۔"

بعد ازاں فرمایا "میرے لئے لمبی چوڑی قبر نہ کھدوائی جائے۔ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاں مستحق رحمت ہوں تو میری قبر از خود حد نگاہ تک وسیع ہو جائے گی، اگر مستحق رحمت نہیں ہوں تو قبر کی وسعت میرے عذاب کی تنگی کو دور نہیں کر سکتی۔ میرے جنازہ کے ساتھ کوئی عورت نہ چلے، اور مجھے مصنوعی صفات سے یاد نہ کیا جائے جب میرا جنازہ تیار ہو جائے تو مجھے جلد سے جلد قبر میں پہنچا دیا جائے۔ اگر میں مستحق رحمت ہوں تو مجھے رحمت ایزدی تک پہنچانے میں جلدی کرنی چاہئے اگر میں مستحق عذاب ہوں تو ایک برے آدمی کا بوجھ جس قدر جلد کندھوں سے اتار پھینکا جائے اسی قدر بہتر ہوگا۔" ان درد انگیز وصایا کے تھوڑا ہی عرصہ بعد داعی اجل کو لبیک کہا۔

یہ ہفتہ کا دن تھا سنہ ۲۴ھ۔ اس وقت عمر ۶۳ برس کی تھی حضرت صہیبؓ نے نماز جنازہ پڑھائی حضرت عبدالرحمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ

حضرت سعد بن وقاصؓ اور حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف نے قبر میں اتارا، اور اس طرح دنیائے اسلام کا وہ درخشندہ آفتاب جس نے ایمانِ محکم، حق گوئی، حق پرستی اور اخلاصِ عمل کی غیر متناہی ضیا پاشیوں سے اقصائے عالم کو منور کر دیا تھا، رحمۃ للعالمینؐ کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے سلا دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مسلمانوں کو حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت سے جو صدمہ ہوا، الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ہر مسلمان نے اپنی عقل کے مطابق انتہائی رنج والم کا اظہار کیا۔ حضرت ام ایمنؓ نے کہا: "جس روز عمرؓ شہید ہوئے اسی روز اسلام کمزور پڑ گیا"۔ حضرت ابو اسامہؓ نے کہا: "حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اسلام کے مائی باپ تھے۔ وہ گذر گئے تو اسلام یتیم ہو گیا"۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان صفات کے لوگ مرتے نہیں، بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ موت ان کے لئے ہے جو ایمانِ محکم، اخلاص اور تقویٰ سے عاری ہوں۔



شہادتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عثمانؓ ذوالنورین خلفائے راشدین میں بجائے خود منفرد صفات کے حامل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شرم وحیا میں انہیں سب پر فضیلت دیتے تھے ایک مجلس میں صحابہ کرام موجود تھے، اور حضورؐ کے ساقِ مبارک سے کپڑا اونچا ہو گیا۔ پنڈلی کو فوراً ڈھانپ لیا اور فرمایا عثمان چلا آرہا ہے۔ ایمانِ محکم، ایثار، اور خدمتِ خلق میں بھی بڑا رتبہ رکھتے تھے۔ آگے چل کر بالتفصیل ذکر آئے گا کہ جب مسجدِ نبوی کی زمین تنگ تھی تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر زمین خرید کے اسے مسجد کے لئے وقف کر دیا۔ مدینہ طیبہ میں بیرِ رومہ کے علاوہ میٹھے پانی کا کوئی کنواں نہ تھا، اور مسلمان روزانہ قلتِ آب سے تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ آپ نے یہ کنواں خرید کر تمام مسلمانوں پر وقف کر دیا۔ جہاد کی غرض سے لشکرِ عسرت کا ساز و سامان آپ ہی نے مہیا اور آراستہ کیا تھا۔ اور آپ کے لئے یہ کتنی بڑی دلیلِ فضیلت ہے

ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے حدیبیہ کے مقام پر آپ کو اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا، تو اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دے کر خود ان کی طرف سے بیعت لی تھی۔ علاوہ ازیں باغیوں کے سامنے اپنے بیان کے مطابق آپ یہ ناقابلِ تردید حقائق پیش کرتے ہیں کہ "میں اسلام میں چوتھا مسلمان ہوں۔ رسول اللہ نے مجھ سے اپنی صاحبزادی کا نکاح کیا۔ ان کا انتقال ہو گیا تو دوسری صاحبزادی نکاح میں مرحمت فرمائی[1]۔ میں نے کبھی نہیں گایا۔ میں نے کبھی کسی گناہ کی خواہش نہیں کی۔ جس وقت سے میں نے رسول اللہ صلعم کی بیعت کی تھی، میں نے بر بنائے احترام اپنا دایاں ہاتھ کبھی اپنی شرمگاہ کو نہیں لگایا۔ لیکن جب سے مسلمان ہوا ہوں، میں نے ہر جمعہ کے دن ایک غلام آزاد کیا۔ میں نے زمانۂ جاہلیت میں یا بعد قبولِ اسلام کبھی زنا نہیں کیا۔ میں نے زمانۂ جاہلیت میں یا مسلمان ہونے کے بعد کبھی چوری نہیں کی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ پاک ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔"

الغرض آپ کے فضائل و مناقب بے شمار ہیں۔ اور آپ کی سب سے بڑی اور فقید المثال قربانی یہ ہے کہ باغیوں میں محصور ہو جانے کے بعد اپنے حامیوں اور جانبازوں کی تعداد کثیر موجود رہتے ہوئے بھی انہیں جنگ آزما ہونے کی اجازت ہرگز نہ دی، تاکہ امت میں فتنہ و فساد اور قتل و قتال کا باعث نہ بنیں، اور اسی مقدس نصب العین کی خاطر جامِ شہادت بلا تامل نوش فرما لیا۔ تفصیلات ملاحظہ ہوں:

باغیوں کا ایک بہت بڑا گروہ، جس میں اکثریت فتنہ انگیز منافقین کی تھی، اور جو

---

[1] اسی بنا پر آپ کو "ذو النورین" کہا جاتا ہے۔

آپ پر اقربا نوازی اور اہم عہدوں پر افراد کے غلط تعین کا الزام لگائے تھے، جب آپ کے مکان کا محاصرہ کر بیٹھا، تو حضرت عثمان نے متعدد بار انہیں حقائق سمجھانے کی کوشش فرمائی۔ ایک دفعہ آپ محل سرائے کی چھت پر تشریف لے گئے، اور باغیوں کو مخاطب کر کے کہا: "اے لوگو! وہ وقت یاد کرو جب مسجد نبوی کی زمین تنگ تھی اور رسول اللہ نے فرمایا تھا: کون ہے جو اللہ کے لئے اس زمین کو خرید کر مسجد کے لئے وقف کر دے، اور جنت میں اس سے بہتر جگہ کا وارث ہو۔" وہ کون تھا جس نے رسول اللہ کے اس حکم کی تعمیل کی تھی؟" آوازیں آئیں "آپ نے تعمیل کی تھی!" پھر فرمایا "کیا تم آج اسی مسجد سے مجھے نماز پڑھنے سے روکتے ہو؟ اور میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کہ وہ وقت یاد کرو جب مدینہ میں بیر رومہ کے سوا میٹھے پانی کا کوئی کنواں نہ تھا اور تمام مسلمان روزانہ قلت آب سے تکلیفیں اٹھاتے تھے۔ وہ کون تھا جس نے رسول اللہ کے حکم سے اس کنویں کو خریدا اور عام مسلمانوں پر وقف کر دیا؟" آوازیں آئیں "یہ آپ نے وقف فرمایا تھا۔" حضرت عثمان نے فرمایا "تم آج اسی کنویں کے پانی سے مجھے روک رہے ہو؟" پھر فرمایا: "لشکر عسرت کا ساز و سامان کس نے آراستہ کیا تھا؟" لوگوں نے جواب دیا "آپ ہی نے" پھر آپ نے فرمایا "کیا تم صدق و اخلاص سے اس واقعہ کی تصدیق نہیں کر سکتے کہ جب ایک دفعہ رسول اللہ احد پہاڑ پر چڑھے تو وہ ہلنے لگا۔ آپ نے اس پہاڑ کو ٹھکرایا اور فرمایا "اے احد! ٹھہر جا کہ اس وقت تیری پیٹھ پر ایک نبی، ایک صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں، اور میں بھی اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا؟" آوازیں آئیں "آپ نے سچ فرمایا" بعد ازیں آپ نے دریافت فرمایا: "اے لوگو! خدا کے لئے مجھے بتاؤ کہ جب رسول اللہ نے

تجھے حدیبیہ کے مقام پر اپنا سفیر بنا کر قریش کے پاس بھیجا تھا تو کیا واقعہ پیش آیا تھا؟ کیا یہ صحیح نہیں کہ رسول اللہ نے اپنے ایک ہاتھ کو میرا ہاتھ قرار دے کر میری طرف سے خود ہی بیعت لی تھی؟ مجمع میں سے آوازیں آئیں " آپ سچ فرماتے ہیں " لیکن افسوس کہ فضل و شرف کے اس اعتراف کے باوجود باغیوں کے پست دماغ سے مفسدانہ خمار دور نہ ہوا حج کی تقریب چند ہی روز میں ختم ہوئی چاہتی تھی اور باغیوں کو خطرہ تھا کہ مسلمان حج سے فارغ ہو کر مدینہ کی طرف پلٹ آئیں گے، اور اس کے ساتھ ہی ان کا سارا منصوبہ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے انہوں نے فی الفور اعلان کر دیا کہ حضرت عثمان کو قتل کر دیا جائے۔ حضرت امیر المومنین نے یہ ندا اپنے کانوں سے سنی اور فرمایا: " اے لوگو! تم کیا جرم کی پاداش میں میرے خون کے پیاسے ہو؟ شریعت اسلامی میں کسی شخص کے قتل کی تین ہی صورتیں ہیں۔ اس نے بدکاری کی ہو تو اسے سنگسار کیا جاتا ہے، اس نے قتل عمد کیا ہو تو وہ قصاص میں مارا جاتا ہے، وہ مرتد ہو گیا ہو تو اسے انکارِ اسلام پر قتل کر دیا جاتا ہے تم اللہ کے لئے بتاؤ! کیا میں نے کسی کو قتل کیا ہے؟ کیا تم مجھ پر بدکاری کا الزام لگاتے ہو؟ کیا میں رسول اللہ کے دین سے پھر گیا ہوں؟ سنو، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ ایک ہے اور حضرت محمد رسول اللہ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ کیا اس کے بعد بھی تمہارے پاس میرے قتل کی وجہ جواز باقی ہے؟"

حضرت عثمانؓ کے ان دردناک الفاظ کا کسی کے پاس کوئی جواب موجود نہ تھا لیکن پھر بھی مفسدین کے دلوں میں خوفِ خدا پیدا نہ ہوا، اور مفسدین کی جماعت اپنے ناپاک ارادوں پر اب بھی قائم تھی۔

جب حالات بہت زیادہ نازک ہو گئے تو حضرت مغیرہ بن شعبہ حضرت عثمان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا "اے امیر المومنین! میں اس نازک وقت میں تین رائیں عرض کرتا ہوں۔ آپ کے طرفداروں اور جانبازوں کی ایک طاقتور جماعت یہاں موجود ہے۔ آپ جہاد کا حکم دیجئے، کیونکہ اس وقت بے شمار مسلمان رفاقتِ حق کے لئے کمربستہ ہیں۔ اگر یہ رائے مقبول نہ ہو تو آپ صدر دروازہ کے سامنے کی دیوار توڑ کر محاصرہ سے نکلئے، اور مکہ معظمہ تشریف لے جائیے۔ وہاں کے لوگ وفادار ہیں۔ وہ آپ کا ساتھ دیں گے۔" پیکرِ استقلال حضرت عثمانؓ نے فرمایا: "میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ نہیں کر سکتا مجھے یہ منظور نہیں کہ میں رسول اللہؐ کا خلیفہ ہو کر امت کا خون بہاؤں۔ میں وہ خلیفہ نہیں بنوں گا جو امتِ محمدیہ میں خونریزی کی ابتدا کرے۔ میں مکہ معظمہ میں بھی نہیں جا سکتا، کیونکہ میں نے اپنے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قریش میں سے کوئی آدمی حرمِ محترم میں فتنہ و فساد کرے گا، اور اس پر آدھی دنیا کا عذاب ہوگا۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وعید کا کبھی مورد نہیں بن سکتا۔ باقی رہا شام کا ارادہ تو یہ میرے لئے کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میں اپنے دارِ ہجرت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس کی نعمت کو پسِ پشت ڈال دوں، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی ترک کر دوں۔"

حالات اور زیادہ نازک ہو گئے تو آپ نے باغیوں کے سامنے اپنی چند ایمانی و روحانی صفات کا تذکرہ کیا، جنہیں ابتدا میں گنوایا گیا ہے، لیکن یہ صدا بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

جب حالات پہلے سے بھی زیادہ نازک ہو گئے، تو حضرت عبداللہ بن زبیرؓ

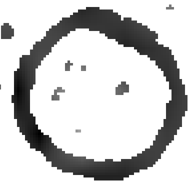
حاضر خدمت ہوئے اور عرض کی: "اے خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت سات سو جانبازوں کی جمعیت محل سرا کے اندر موجود ہے۔ ایک بار اجازت دیجیے کہ ہم باغیوں کی طاقت آزمالیں۔" ارشاد فرمایا: "میں خدا کا واسطہ دیتا ہوں کہ ایک بھی مسلمان میرے لیے خون نہ بہائے۔" پھر بیس غلاموں کو جو گھر میں موجود تھے، طلب فرمایا۔ وہ حاضر ہوئے تو فرمایا: "آج تم اللہ کے لیے آزاد ہو۔" اس وقت زید بن سعدؓ حاضر ہوئے، اور عرض کیا: "اے امیر المومنین! رسول اللہ کے انصار دروازہ پر کھڑے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ آج پھر اپنا وعدۂ نصرت پورا کر دیں۔" اگر لڑائی مقصد ہے تو اجازت نہ دوں گا۔ آج میری سب سے بڑی حمایت یہ ہے کہ کوئی مسلمان میرے لیے تلوار نہ اٹھائے۔" حضرت ابو ہریرہؓ تشریف لائے اور نہایت انکسار کے ساتھ جہاد کی اجازت طلب کی۔ وہ جانتے تھے کہ نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے جہاد کا ایک لفظ لاکھوں مسلمانوں کو ان کے جھنڈے تلے جمع کر دے گا۔ لیکن آپ نے ارشاد فرمایا: "اے ابو ہریرہؓ! کیا تمہیں یہ پسند آئے گا کہ تم تمام دنیا کے ساتھ مجھے بھی قتل کر دو؟" حضرت ابو ہریرہؓ نے عرض کیا: "اے امیر المومنین! کوئی بھی مسلمان اس چیز کو پسند نہیں کر سکتا۔" آپ نے فرمایا: "اگر تم نے ایک شخص کو بھی ناحق قتل کیا تو گویا تم نے سب مخلوق قتل کر دی۔" یہ سورہ مائدہ کی ایک آیۃ کا مفہوم ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے یہ سنا تو خاموش ہو گئے اور واپس تشریف لے گئے۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عثمانؓ کے متعلق پیش گوئی فرما چکے تھے۔ عام مسلمان حضرت عثمانؓ کی خاموشی اور باغیوں کی تباہ کاریوں پر خون کے آنسو رو رہے تھے۔ مگر حضرت عثمانؓ بالکل چپ تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

پیش گوئی کی تکمیل کا انتظار فرما رہے تھے۔ ابھی جمعہ کا آفتاب طلوع نہ ہوا تھا کہ آپ نے روزہ کی نیت فرمائی۔ اسی صبح خواب میں دیکھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں، اور حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ آپ کے ہمرکاب ہیں جنھوں نے حضرت عثمان سے فرمایا "عثمان جلدی آؤ ہم یہاں افطاری کے لئے تمہارے منتظر بیٹھے ہیں" آنکھ کھلی تو اپنی اہلیہ محترمہ سے فرمایا "میری شہادت کا وقت قریب آگیا ہے۔ اور باغی مجھے ابھی قتل کر ڈالیں گے۔" انہوں نے دردمندانہ کہا "امیر المومنین، ایسا نہیں ہو سکتا" آپ نے فرمایا "میں یہ خواب دیکھ چکا ہوں"۔ جب بستر سے اٹھے تو آپ نے وہ پاجامہ طلب فرمایا جس کو آپ نے کبھی نہیں پہنا تھا، اور اسے زیب تن فرمایا پھر بیس غلاموں کو آزاد کر کے کلام اللہ کو کھولا اور اس کی تلاوت میں مصروف ہو گئے۔

یہ حضرت عثمانؓ کے حرم سرا کے اندرونی حالات تھے۔ ٹھیک اسی وقت محل سرا کے باہر محمد بن ابو بکرؓ نے تیر چلانے شروع کر دیئے۔ ایک تیر حضرت حسنؓ کو جو دروازے پر کھڑے تھے، لگا اور وہ زخمی ہو گئے دوسرا تیر محل کے اندر مروان تک پہنچا۔ ایک تیر سے حضرت علیؓ کے غلام قیسر کا سر زخمی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر محمد بن ابو بکرؓ کو خوف پیدا ہوا کہ امام حسنؓ کا خون رنگ لائے بغیر نہیں رہے گا۔ یہ سوچ کر انہوں نے اپنے دو ساتھیوں سے کہا کہ "اگر بنی ہاشم پہنچ گئے تو وہ حسنؓ کو زخمی دیکھ کر عثمانؓ کو بھول جائیں گے، اور ہماری تمام کوششیں ناکام ہو جائیں گی۔ اس لئے چند آدمی اسی وقت محل سرا میں کود پڑیں، اور اپنا کام ختم کر دیں۔ محمد بن ابو بکرؓ کے ساتھیوں نے اس تجویز کے ساتھ اتفاق کیا۔ اور اسی وقت چند باغی دیوار پھاند کر محل سرا میں داخل ہو گئے۔ اس وقت جتنے بھی مسلمان محل سرا میں موجود تھے، اتفاق سے وہ سب اوپر کی منزل میں بیٹھے تھے،

اور حضرت عثمانؓ نیچے کی منزل میں تن تنہا مصروف تلاوت تھے محمد بن ابوبکرؓ نے ہاتھ بڑھا کر حضرت عثمان کی ریش مبارک پکڑ لی اور اسے زور زور سے کھینچنے لگا۔ حضرت عثمان نے فرمایا بھتیجے! اگر آج صدیق اکبر زندہ ہوتے تو اس منظر کو ہرگز پسند نہ فرماتے یہ سن کر محمد بن ابوبکرؓ پشیمان ہوا اور پیچھے ہٹ گیا۔ مگر کنانہ بن بشر نے پیشانی مبارک پر لوہے کی سلاخ سے ایک دردناک ضرب لگائی اور یہ نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ زخمی ہو کر زمین پر گر پڑا اور فرمایا "بسم اللہ۔ توکلت علی اللہ" دوسری ضرب سودان بن حمران نے ماری جس سے خون کا فوارہ چل گیا عمرو بن حمق کو یہ سفاہت نادانی معلوم ہوئی۔ یہ ذلیل ترین بدوی حضرت عثمان کے سینے پر کھڑا ہو گیا، اور جسم مبارک دمعلم کو نیزے سے چھیدنے لگا۔ اسی وقت ایک اور بے رحم نے تلوار چلائی اور حضرت نائلہ نے اسے ہاتھ سے روکا تو ان کی تین انگلیاں کٹ کر گر گئیں۔ اسی کش مکش کے دوران میں حضرت امیر المومنین بے دم ہو رہے تھے کہ مرغ روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔



شہادتِ علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

تاریخِ اسلام میں خوارج کے فتنوں نے دین کی آڑ میں کتنے ہی سیاسی ہنگامے برپا کئے، اور مقصد تھا حصولِ اقتدار۔ خوارج کا عقیدہ یہ تھا کہ خدا کے بندوں پر حکومت بھی صرف خدا ہی کی ہونی چاہئے۔ مخلوقات میں سے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسان پر حکومت کرے۔ یہ لوگ اپنے عقیدے کی نشر و اشاعت کرتے رہے یہاں تک کہ ان کی تعداد وسیع و بسیط ہوتی گئی۔ چنانچہ ان ہی نے سازش کی کہ حضرت علیؓ کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ خدا کے بندوں پر ایک انسان کی حکومت و قیادت کا بھی خاتمہ ہو جائے۔ چنانچہ اس مغضوب و ملعون مہم کے لئے ایک شخص ابنِ ملجم کا تقرر عمل میں لایا گیا۔ اقدامِ قتل جمعہ کے دن نمازِ فجر کے وقت ہوا رات بھر ابنِ ملجم اشعث بن قیس کندی کی مسجد میں اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ اس نے کوفہ میں شبیب بن بجرہ نامی ایک اور خارجی کو اپنا شریکِ کار بنایا تھا۔ دونوں تلواریں لے کر چلے، اور اس دروازے کے مقابل بیٹھ گئے جس سے امیر المومنین نکلا کرتے تھے۔ (ابن سعد)

اس رات امیر المومنین کو نیند نہیں آئی حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ سحر کے وقت میں حاضر ہوا تو فرمایا، فرزند! میں رات بھر جاگتا رہا ہوں۔ ذرا دیر ہوئی بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی تھی خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا میں نے عرض کیا "یا رسول آپ کی امت سے میں نے بڑی تکلیف پائی" فرمایا دعا کر کہ خدا تجھے ان سے چھٹکارا دے دے" اس پر میں نے دعا کی "خدایا! مجھے ان سے بہتر رفیق عطا فرما اور انہیں مجھ سے بہتر ساتھی دے۔"

(کامل۔ ابن سعد)

حضرت حسن علیہ السلام فرماتے ہیں "اسی وقت ابن النباح موذن بھی حاضر ہوا اور پکارا "لوگو! نماز کی طرف آؤ!" یہ سن کر میں نے آپ کا ہاتھ تھام لیا۔ آپ اٹھے ابن النباح آگے تھا، میں پیچھے تھا۔ دروازے کے باہر نکل کر آپ نے پکارا "لوگو، نماز" روزانہ آپ کا یہی دستور تھا کہ لوگوں کو نماز کے لیے مسجد میں آنے کے لئے جگاتے پھرتے تھے۔

(ابن سعد)

ایک روایت میں ہے کہ موذن کے پکارنے پر ضعف کے باعث اٹھ نہیں سکے بلکہ لیٹے رہے۔ موذن دوبارہ آیا۔ مگر آپ سے پھر بھی اٹھا نہ گیا۔ سہ بارہ اس کے آواز دینے پر آپ بمشکل یہ شعر پڑھتے ہوئے اٹھے، جن کا مفہوم یہ ہے:-

۱۔ موت کے لئے کمر کس لے، کیونکہ موت تجھ سے ضرور ملاقات کرنے والی ہے۔

۲۔ اگر موت تیرے ہاں نازل ہو جائے، تو اس سے ہرگز خوفزدہ نہ ہو۔

آپ گھر سے نکل کر جونہی آگے بڑھے، دو تلواریں چمکتی نظر آئیں، اور ایک آواز بلند ہوئی: "اے علی! حکومت خدا کی ہے، نہ کہ تیری!" شبیب کی تلوار تو طاق پر پڑی لیکن ابن ملجم کی تلوار آپ کی پیشانی پر لگی، اور دماغ پر اتر گئی۔ زخم کھاتے ہی آپ چلائے

پروردگار کی قسم! میں کامیاب ہو گیا" اور ساتھ ہی آپ نے فرمایا: "دیکھو، قاتل جانے نہ پائے" لوگ ہر طرف سے ٹوٹ پڑے۔ شبیب تو نکل بھاگا، لیکن ابن ملجم نے تلوار گھمانا شروع کر دی اور مجمع کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ قریب تھا کہ وہ بھی مفرور ہو جائے لیکن مغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب جو اپنے وقت کے مشہور پہلوان تھے، ان کے پیچھے دوڑے اور ایک بھاری کپڑا اس پر ڈال دیا، اور زمین پر دے مارا۔ (الکامل)

امیر المومنین گھر پہنچائے گئے۔ آپ نے قاتل کو طلب کیا جب وہ سامنے آیا تو فرمایا: "او دشمن خدا! کیا میں نے تجھ پر احسان نہیں کئے تھے؟" اس نے کہا ہاں! فرمایا "پھر تو نے یہ حرکت کیوں کی؟" کہنے لگا "میں نے اس تلوار کو چالیس دن تیز کیا تھا اور خدا سے دعا کی تھی کہ اس سے اپنی بدترین مخلوق قتل کرائے" حضرت علیؓ نے فرمایا "تو اسی تلوار سے قتل کیا جائے گا، اور میں سمجھتا ہوں کہ تو ہی خدا کی بدترین مخلوق ہے"

آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم نے پکار کر کہا: "او دشمن خدا! تم نے امیر المومنین کو قتل کر ڈالا!" کہنے لگا: "میں نے امیر المومنین کو قتل نہیں کیا، البتہ تمہارے باپ کو قتل کیا ہے" انہوں نے خفا ہو کر کہا: "واللہ میں امید کرتی ہوں کہ امیر المومنین کا بال بیکار نہ ہوگا" کہنے لگا: "پھر تم سوئے کیوں جاتی ہو؟ بخدا میں نے مہینہ بھر اس تلوار کو زہر پلایا ہے۔ اگر اب بھی یہ بے وفائی کرے تو خدا اسے غارت کر دے" (ابن سعد)

امیر المومنین نے حضرت حسنؓ سے کہا "یہ قیدی ہے۔ اس کی خاطر تواضع کرو۔ اچھا کھانا دو۔ نرم بچھونا دو۔ اگر میں زندہ رہوں گا تو اپنے خون کا سب سے زیادہ دعویدار میں ہوں گا۔ قصاص لوں گا یا معاف کر دوں گا۔ اگر مر جاؤں گا تو اسے بھی میرے پیچھے روانہ کر دینا۔ رب العالمین کے حضور اس سے جواب طلب کروں گا" (ابن سعد)

پھر آپ نے فرمایا: "اے بنی عبد المطلب! ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کی خونریزی شروع کر دو، اور کہو کہ امیر المومنین قتل ہو گئے۔ خبردار میرے قاتل کے سوا اور کسی کو قتل نہ کیا جائے۔ اے حسنؓ! اگر میں اس کی اس ضرب سے مر جاؤں تو ایسی ہی ضرب سے اسے بھی مارنا۔ اس کے ناک، کان کاٹ کر لاش کو خراب نہ کرنا کیونکہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ خبردار ناک کان نہ کاٹو، اگرچہ وہ کتا ہی کیوں نہ ہو۔"

(طبری)

ایک روایت میں ہے کہ فرمایا: "اگر تم قصاص لینے ہی پر اصرار کرو تو چاہیئے کہ اسے اسی طرح ایک ضرب سے مارو جس طرح اس نے مجھے مارا، لیکن اگر معاف کر دو تو یہ چیز تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ دیکھو زیادتی نہ کرنا، کیونکہ خدا زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔" (کامل۔ ابن سعد)

آپ کی وصیت:۔

پھر آپ بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش میں آئے تو جندب بن عبد اللہ نے حاضر ہو کر کہا: "خدانخواستہ اگر آپ وفات پا گئے تو کیا ہم حسنؓ کے ہاتھ پر بیعت کریں؟" آپ نے جواب دیا: "میں تمہیں نہ اس کا حکم دیتا ہوں نہ اس سے منع کرتا ہوں۔ اپنی مصلحت تم بہتر سمجھتے ہو۔"

پھر اپنے صاحبزادوں حسنؓ اور حسینؓ کو بلا کر فرمایا:۔

میں تم دونوں کو تقویٰ الٰہی کی وصیت کرتا ہوں، اور اس کی کہ دنیا کا پیچھا نہ کرنا۔ اگرچہ وہ تمہارا پیچھا کرے۔ جو چیز تم سے دور ہو جائے اس پر نہ کڑھنا۔

ہمیشہ حق کہنا اور حق کرنا۔ یتیم پر رحم کھانا، بے کس کی مدد کرنا، آخرت کے لئے عمل کرنا، ظالم کے دشمن بننا، اور مظلوم کے حامی، کتاب اللہ پر چلنا، خدا کے معاملات میں ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرنا!"

پھر اپنے تیسرے صاحبزادے محمد بن الحنفیہ کی طرف دیکھ کر فرمایا: "جو نصیحت میں نے تیرے بھائیوں کو کی، کیا تو نے حفظ کر لی؟" انہوں نے عرض کی "جی ہاں" فرمایا "میں تجھے بھی یہی وصیت کرتا ہوں۔ علاوہ ازیں تجھے وصیت کرتا ہوں کہ اپنے دونوں بھائیوں کے حقوقِ عظیم کا خیال رکھنا، ان کی اطاعت کرنا، اور ان کی رائے کے بغیر کوئی کام نہ کرنا" پھر امام حسنؓ اور امام حسینؓ سے فرمایا "میں تمہیں اس بارے میں وصیت کرتا ہوں، کیونکہ یہ تمہارا بھائی ہے، تمہارے باپ کا بیٹا ہے، اور تم جانتے ہو کہ تمہارا باپ اس سے محبت کرتا ہے!"

بعد ازیں امام حسن سے فرمایا "فرزند! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں:۔ خوف خدا کی، اپنے اوقات میں نماز قائم کرنے کی، میعاد پر زکوٰۃ ادا کرنے کی، ٹھیک وضو کرنے کی، کیونکہ نماز بغیر طہارت ممکن نہیں، اور مانع زکوٰۃ کی نماز قبول نہیں، نیز وصیت کرتا ہوں خطائیں معاف کرنے کی، دین میں عقل و دانش کی، ہر معاملہ میں تحقیق کی، قرآن سے مزاولت کی، پڑوسی سے حسنِ سلوک کی، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی اور خواہش سے اجتناب کی۔" (طبری، جلد ۶)

پھر اپنی تمام اولاد کو مجموعی طور پر مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا اور اس کے احکام کی اطاعت کرو، جو تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے، اس کے لئے رنج و غم نہ کرو۔ اللہ کی عبادت

پر کمر بستہ رہو۔ نیک اعمال میں چست و چالاک بنو۔ سست نہ بنو۔ ذلت قبول نہ کرو۔ خدا یا ہم سب کو ہدایت پر جمع کر دے۔ ہمیں اور انہیں دنیا سے بے رغبت کر دے۔ ہمارے اور ان کے لئے آخرت اول سے بہتر کر دے۔"

وفات کے وقت آپ نے یہ وصیت لکھوائی: یہ علی ابن طالب کی وصیت ہے۔ "وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اس کے بندے اور رسولؐ ہیں۔ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے، اور میں سب سے پہلا فرمانبردار مسلمان ہوں پھر اے حسنؓ! میں تجھے اور تمام اولاد کو یہ وصیت کرتا ہوں کہ خدا کا خوف کرنا، اور جب مرنا تو اسلام ہی پر مرنا سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو، کیونکہ میں نے ابوالقاسم (رسول اکرمؐ) کو فرماتے سنا ہے کہ آپس کا ملاپ قائم رکھنا روزے نماز سے بھی افضل ہے۔" اپنے رشتہ داروں کا خیال رکھو، ان سے بھلائی کرو خدا تم پر حساب آسان کر دے گا اور ہاں یتیموں کا خیال رکھو، ان کے منہ میں خاک مت ڈالو۔ وہ تمہاری موجودگی میں ضائع نہ ہونے پائیں اور دیکھو تمہارے پڑوسی! اپنے پڑوسیوں کا خیال رکھو کیونکہ یہ تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر پڑوسیوں کے حق میں وصیت فرماتے رہے، یہاں تک کہ ہم سمجھے شاید انہیں ورثہ میں شریک کر دیں گے۔ اور دیکھو قرآن! ایسا نہ ہو کہ قرآن پر عمل کرنے میں کوئی تم پر سبقت لے جائے۔ اور نماز کی حفاظت کرو۔

کیونکہ وہ تمہارے دین کا ستون ہے۔ اور تمہارے رب کا گھر (بیت اللہ شریف)
اپنے رب کے گھر سے غافل نہ ہو جانا۔ اور جہاد فی سبیل اللہ (۔۔۔ اللہ کی راہ
میں اپنے جان و مال سے جہاد کرتے رہو۔ اور زکوٰۃ (زکوٰۃ تمہارے پروردگار
کا غصہ ٹھنڈا کرتی ہے۔ اور ہاں تمہارے نبیؐ کے ذمّی (یعنی وہ غیر مسلم
جو تمہاری حفاظت میں تمہارے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں) ایسا نہ ہو کہ ان پر
تمہارے سامنے ظلم کیا جائے (۔۔۔ اور تمہارے نبیؐ کے صحابی (یاد رکھو!
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابیوں کے حق میں وصیت کی ہے
اور فقراء مساکین (انہیں اپنی روزی میں شریک کرو اور ان سے فیاضی کا
برتاؤ رکھو۔ اور تمہارے غلام غلاموں کا خیال رکھنا (کہ ان پر کسی قسم کا ظلم
نہ ہو) اللہ تعالیٰ کے معاملات میں اگر مخلوقات میں سے کسی کی بھی پروا نہ
کروگے تو اللہ تمہارے دشمنوں سے تمہیں محفوظ کردے گا۔ خدا کے نیک بندوں
سے محبت و رعایت کا سلوک رکھو۔ ان سے میٹھی بات کرو، کیونکہ ایسا ہی خدا
نے حکم دیا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ چھوڑنا، ورنہ تمہارے
اشرار تم پر مسلط کر دیئے جائیں گے پھر تم دعائیں کروگے مگر وہ قبول نہ ہوں
گی۔ باہم ملے جلے رہو۔ بے تکلف اور سادگی پسند رہو۔ خبردار ایک دوسرے
سے نہ کٹنا، اور نہ آپس میں پھوٹ ڈالنا۔ نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے
کے مددگار رہنا، مگر گناہ اور زیادتی میں کسی کی مدد نہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ سے
ڈرتے رہو، کیونکہ اس کا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔ اے اہل بیت! خدا
تمہیں محفوظ رکھے اور اپنے نبی کریمؐ کے طریقہ پر قائم رکھے۔ میں تمہیں خدا ہی

کے سپرد کرتا ہوں، اور تمہارے لئے سلامتی اور برکت چاہتا ہوں۔" بعد ازیں آپ نے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا اور جان اپنے جان آفرین کے سپرد کی۔

حیدرِ کرار کی سیرت و سوانح سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ آپ نہ صرف تقویٰ، خلوص، للٰہیت اور اتباع کتاب و سنت میں کامل تھے، اور مسائل و علوم شرعیہ میں حکمت و دسترس رکھتے تھے، بلکہ قوت و سطوت اور جرأت و شجاعت میں بھی یکتائے روزگار تھے۔ قبولِ اسلام کے بعد آپ کی قوت و شجاعت اسلام اور ملتِ بیضا کے فروغ و ارتقار کے لئے وقف رہی۔ علم فراست کے ساتھ ہی ساتھ آپ نے قوتِ بازو اور ذوالفقار[۱] سے بھی حصارِ اسلام کو اور زیادہ مستحکم کیا، اور جہاد فی سبیل اللہ میں ایسی عظیم الشان فتوح سے ہمکنار ہوئے، جن کے تصور سے بھی کفار ہمیشہ لرزہ براندام رہتے تھے۔ اگرچہ بالآخر وہ خود بھی خوارج کے ایک سیاسی فتنہ و ہنگامہ کا شکار ہو گئے، لیکن انہوں نے صحیح عقائدِ اسلامیہ کی حقیقتِ ابدی کو کبھی مسخ نہ ہونے دیا۔ "ابوتراب[۲]" آپ کی کنیت تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی شجاعت اور قوتِ تسخیر کے پیشِ نظر آپ کو اسد اللہ[۳] کا خطاب مرحمت فرمایا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے "اسرارِ خودی" میں ان اسمائے علی مرتضیٰؓ کی حکمت و ماہیت بیان فرمائی ہے، جس کا تذکرہ یہاں بے جا نہیں ہوگا۔ اس میں ہر مسلمان کے لئے چند در چند روحانی، اخلاقی اور عملی نکات و مفادات مضمر ہیں۔

---

۵۱ حضرت علیؓ کی تلوار کا نام ۵۲ یعنی "مٹی کا باپ" ۵۳ یعنے "اللہ کا شیر"

مسلمِ اول شہِ مردان علیؓ
عشق را سرمایۂ ایمان علیؓ

وہ سب سے پہلے مسلمان مردوں کے بادشاہ علیؓ
وہ علیؓ کہ عشقِ حق تعالیٰ کے لئے سرمایہ ایمان ہیں

ہر کہ دانائے رموزِ زندگیست
شرحِ اسمائے علیؓ داند کہ چیست

جو شخص بھی رموزِ زندگی سے بخوبی آگاہ ہے
وہ اسمائے علیؓ کا مفہوم و مطلب اچھی طرح سمجھتا ہے

خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است
عقل از بیدادِ او در شیون است

وہ خاکِ تاریک جسے جسد انسانی کہتے ہیں
عقل اس کی کج روی اور ستم سے آہ و بکا کرتی ہے

فکرِ گردوں رس زمیں پیما ازو
چشم کور و گوش ناشنوا ازو

آسمان کی سیر کرنے والی فکر اس سے زمین کی پستی پر ہے
اس کے باعث آنکھیں حقیقت سے اندھی اور کان بہرے

از ہوس تیغِ دو رو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست

وہ تنِ خاکی ہوس کی بنا پر دو دھاری تلوار ہاتھ میں لیے ہے
اور اس راہزن سے راہرووں کا دل شکستہ ہو رہا ہے

شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گلِ تاریک را اکسیر کرد

شیرِ خدا نے اسی خاکِ تیرہ کو مسخر کر لیا تھا
اور اس تاریک مٹی کو اکسیر بنا لیا تھا

مرتضیٰ کز تیغِ او حق روشن است
بوتراب از فتحِ اقلیمِ تن است

وہ مرتضیٰ جس کی تلوار سے حق نے فروغ پایا
اقلیمِ تن کو مسخر کرکے "مٹی کا باپ" کہلاتا ہے

مردِ کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خودداری است

مردِ مومن اسی کراری سے ملک فتح کرتا ہے
اور اس کے گوہر کی آبرو خودداری سے ہے

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

جو شخص بھی دنیا میں مٹی کا باپ بن جاتا ہے
وہ سورج کو مغرب سے پلٹ کر لے آتا ہے[1]

[1] یہ حضرت علیؓ کی کرامت رجعتِ آفتاب کی جانب اشارہ ہے۔

ہر کہ زیں بر مرکبِ تن تنگ بست — چوں نگیں بر خاتمِ دولت نشست

جس نے بھی تن کے گھوڑے پر زین خوب کس کے باندھی — وہ دنیا کی انگشتری میں نگ کی مانند بیٹھ گیا

زیرِ پاش ایں جا شکوہِ خیبر است — دستِ او آنجا قسیمِ کوثر است

اس دنیا میں اس کے پاؤں کے نیچے شکوہِ خیبر ہے — اور اُس دنیا میں اس کا ہاتھ آبِ کوثر تقسیم کرنے والا ہے

از خود آگاہی یداللّٰہی کند — از یداللّٰہی شہنشاہی کند

وہ خود شناسی کے باعث اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے — اور اس یداللّٰہی سے اس کو حکومت و سطوت ملتی ہے

ذاتِ او دروازۂ شہرِ علوم[۱] — زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم

اس کی ذات شہرِ علوم کا دروازہ ہے — اور حجاز و چین و روم اس کے زیرِ فرمان ہیں

حکمراں باید شدن بر خاکِ خویش — تا مے روشن خوری از تاکِ خویش

لہٰذا تجھے اپنی خاکِ تن پر حکمران ہونا چاہیئے — تاکہ تو اپنی انگور کی بیل سے مے روشن پیئے

خاک گشتن مذہبِ پروانگی است — خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

مٹی ہو جانا تو صرف مذہبِ پروانگی ہے — تو مٹی کا باپ بن کر جی کہ یہی مردانگی ہے

سنگ شو اے ہمچو گل نازک بدن — تا شوی بنیادِ دیوارِ چمن

اے مثلِ گل نازک بدن، پتھر کی مانند سخت ہو جا — تاکہ تو کسی دیوارِ چمن کی بنیاد بنے

از گلِ خود آدمے تعمیر کن! — آدمے را عالمے تعمیر کن!

اپنی مٹی کے ایک محکم و توانا آدمی تعمیر کر — اور پھر اس آدمی کے لئے ایک نئی دنیا بنا

گر بنا سازی نہ دیوار و درے — خشت از خاکِ تو بندد دیگرے

اگر تو اپنی دنیا کے دیوار و در نہیں بنائے گا — تو کوئی اور تیری مٹی سے اینٹ تیار کرے گا

۱؎ تلمیح بحدیث شریف: اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا یعنی میں علم کا شہر ہوں، اور علیؓ اس شہر کا دروازہ ہے

اے ز جورِ چرخِ ناہنجار تنگ — جامِ تو فریادی بیدادِ سنگ

اے کہ چرخِ ناہنجار کے ظلم و ستم سے تنگ ہے — اور تیرا پیالہ بیدادِ سنگ کے خلاف فریادی ہے

نالہ و فریاد و ماتم تا کجا — سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا

تو کب تک یہ نالہ و فریاد و ماتم جاری رکھے گا — اور کب تک اپنے سینے کو رنج و الم میں پیٹتا رہے گا

در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات — لذتِ تخلیق قانونِ حیات

مضمونِ حیات تو قوتِ عمل ہی میں مخفی ہے — اور یہی قانونِ حیات تخلیق کرنے کی صحیح لذت ہے

خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو — شعلہ در بر کن، خلیلِ آوازہ شو

اٹھ اور ایک جہانِ تازہ کی تعمیر کر — بغل میں شعلۂ توحید لے اور خلیل کا سا نعرہ حق لگا

با جہانِ نامساعد ساختن — ہست در میدان سپر انداختن

ناموافق دنیا کا مطیع ہو جانا تو ایسا ہے — جیسے کوئی سپاہی میدان میں اپنی ڈھال رکھ دے

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار — با مزاجِ او بسازد روزگار

جو شخص بھی محکم و خود دار اور پختہ کار ہے — زمانہ یقیناً اس کے مزاج سے موافقت کرتا ہے

گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں — می شود جنگ آزما با آسماں

اگر دنیا اس کے مزاج کے ساتھ سازگار نہ ہو — تو وہ بے دھڑک آسمان کے ساتھ جنگ آزما ہوتا ہے

بر کند بنیادِ موجودات را — می دہد ترکیبِ نو ذرات را

اور موجودات کو اس کی بیخ و بن سے اکھیڑ پھینکتا ہے — اور پھر نئے ذرات کی ترکیب سے نئی دنیا تعمیر کرتا ہے

گردشِ ایام را برہم زند — چرخِ نیلی فام را برہم زند

وہ گردشِ ایام (زمان) کو درہم برہم کر دیتا ہے — اور چرخِ نیلی فام کی بھی دھجیاں اڑا دیتا ہے

مے کند از قوت خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار

وہ اپنی بے پناہ قوت تسخیر سے وہ نئی دنیا
آشکار کرتا ہے جو اس کے مزاج سے سازگار ہو

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست

اس دنیا میں اگر مردانہ وار زندہ نہ رہا جا سکے
تو بہادروں کی طرح نبرد آزما ہو کر مرنا ہی زندگی ہے

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم

ایک زندہ و توانا دل رکھنے والا شخص تو
اپنی قوت کو ہمیشہ عظیم مہمات ہی سے آزماتا ہے

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است

دشوار مہمات و مقاصد سے عشق رکھنا ہی مسرت انگیز ہے
اور خلیل اللہ کی مانند شعلوں سے پھول چننا ہی خوش

ممکناتِ قوتِ مردانِ کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

مردانِ کار کی طاقت کی تمام ممکنات
مشکل پسندی ہی سے نمایاں ہوا کرتی ہیں

حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را این یک آئین است و بس

اور پست ہمت لوگوں کا حربہ تو بغض و کینہ ہی ہے
اور ان کی زندگی کا مدار کار اسی رذالت پر ہے

زندگانی قوتِ پیداستے
اصل او از ذوقِ استیلاستے

در حقیقت زندگی ایک نمایاں قوت ہے
جس کی بنیاد ذوقِ تسخیر پر رکھی گئی ہے

عفوِ بے جا سردیِ خونِ حیات
سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

عفوِ بے جا خونِ حیات کے انجماد پر دلالت کرتا ہے
اور یہ شعرِ موزونِ حیات میں سکتے کا عیب ہے

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

ہر وہ شخص جو ذلت و نکبت کی گہرائی میں رہ گیا
کمزوری اور ناتوانی کو قناعت کہنے لگا

ناتوانی زندگی را رہزن است — بطنش از خوف و دروغ آبستن است

ناتوانی زندگی کے لئے رہزن کا حکم رکھتی ہے — اور اس کا پیٹ خوف و کذب سے معمور ہے

از مکارم اندرون او تہی است — شیرش از بہر رذائل فربہی است

عمدہ صفاتِ اخلاق سے اس کا باطن خالی ہے — اور اس کا دودھ بری عادات کے لئے باعث ناز

ہوشیار اے صاحبِ عقلِ سلیم — در کمینہا می نشیند ایں غنیم

اے تندرست و بیدار دل رکھنے والے شخص ہوشیار رہ — کیونکہ ناتوانی کا دشمن مختلف جگہ چھپ کر بیٹھا ہے

گر خرد مندی فریب او مخور — مثلِ حربا ہر زماں رنگش دگر

اگر تو عقلمند ہے تو اس کا دھوکا ہرگز نہ کھا — کیونکہ گرگٹ کی مانند یہ دشمن ہر لمحہ اپنا رنگ بدلتا ہے

شکلِ او اہلِ نظر نشناختند — پردہ ہا بر روئے او انداختند

اہلِ نظر اس کی شکل و صورت کو پہچان نہیں سکے — لہٰذا اس کے چہرے پر مختلف پردے ڈال دیے

گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار — گاہ می پوشد ردائے انکسار

کبھی تو رحم اور نرمی اس کی پردہ دار ہے — اور کبھی وہ عجز و انکسار کی چادر اوڑھ کر آتی ہے

گاہ او مستور در مجبوری است — گاہ پنہاں در تہِ معذوری است

کبھی وہ مجبوری و بے بسی کے در پردہ مخفی ہے — اور کبھی معذوری کی تہ میں پوشیدہ ہے

چہرہ در شکلِ تن آسانی نمود — دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود

اس نے اپنا چہرہ نمایاں کیا تو تن آسانی کی صورت میں — اور صاحبِ قوت شخص سے بھی دل چھین کر لے گئی

با توانائی صداقت توام است — گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است

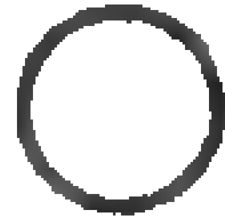
صداقت تو ہمیشہ توانائی کا ساتھ دیتی ہے — اگر تو خود آگاہ ہے تو یہی جامِ جمشید ہے

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرح رمز حق و باطل قوت است

زندگی گویا ایک کھیتی ہے، اور اس کا حاصل قوت ہے
رمز حق و باطل کی شرح بھی قوت و توانائی ہے

اے ز آداب امانت بے خبر
اے کہ تو آدابِ امانت حق سے بے خبر ہے

از دو عالم خویش را بہتر شمر!
بحیثیتِ نائب حق خود کو دونوں جہاں سے بہتر سمجھ



رضی اللہ عنہا

سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراء

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا یہ حق تھا کہ وہ انتہائی خوش بخت ہوتیں اور مسرت و شادمانی کی حالت میں زندگی گزارتیں، کیونکہ وہ تمام مسلمان عورتوں کی سردار، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوب بیٹی تھیں۔ لیکن چونکہ اپنے والد اقدس کی محبت ان کے لئے بمنزلہ عبادت تھی، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ان کے لئے ناقابلِ برداشت صدمہ ثابت ہوئی، اور اس صدمے نے انہیں گھن کی طرح کھالیا۔ ان کے دل میں متواتر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال رہتا اور زبان پر مسلسل حضورؐ ہی کا اسم مقدس۔ جب وہ ماضی کے پردے الٹ کر نظر ڈالتیں تو اپنی پیاری والدہ اور بہنوں کو یکے بعد دیگرے اس دنیا سے رخصت ہوتے دیکھتیں۔ صرف رسول اللہ کی ذات ہی ایسی تھی جس سے ان کے اطمینان اور دل بستگی کا سامان ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ بھی آخر اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، اور فاطمہ اکیلی رہ گئیں۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہ گُم سُم سی رہتی تھیں۔ ان کے ذہن پر صرف آپ ہی کا خیال رہتا تھا، اور زبان پر صرف حضور ہی کا نام۔ انہوں نے اپنے آپ پر لازم کر لیا تھا کہ صبح و شام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک کی زیارت کیا کریں، اور وہاں کھڑے ہو کر آنسوؤں سے اس پاک زمین کو تر کیا کریں جو جسدِ رحمۃ للعالمین سے مشرف و ذی وقار تھی۔ وہاں عشق و محبت کی وارفتگی میں تادیر بیٹھی ہوئی گریہ مسلسل کے گوہر تابدار حضور رسالت میں پیش کرتی رہتیں، اور جب دل کا غبار نکال لیتیں، تو رنجیدہ و افسردہ وہاں سے واپس آجاتیں۔ شدتِ رنج والم نے ان کے کمزور و نحیف جسم کو اور بھی گھلا دیا تھا۔ آخر جدائی ہی کے عالم میں یہ پاک مطہر ہستی اس مقام قدس میں پہنچ گئی جہاں اس سے پہلے اس کے بھائی بہن اور والد پہنچ چکے تھے۔

ایک وقت وہ تھا کہ سیدۃ النساء، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں ان کے سرہانے بیٹھی والد محترم کے غم ہجر و فراق میں بے اختیار رو رہی تھیں، اور حضور نے یہ دیکھ کر ان کے کان میں آہستہ سے کہہ دیا تھا "فاطمہؓ غم نہ کر، میری وفات کے بعد سب سے پہلے تو ہی مجھے ملے گی۔" آج ان کی وفات نے نبی الرحمتؐ کی وہ پیشین گوئی درست ثابت کی اور وہ اس روحِ مقدس سے واصل ہو گئیں!

حضرت فاطمہؓ کی وفات ۳ رمضان ۱۱ھ منگل کو رات کے وقت ہوئی۔ اس وقت آپ کی عمر ستائیس یا انتیس سال کی تھی۔[۱۵]

---

۱۵ الطبری - ابن اثیر

مسعودی نے بیان کیا ہے کہ حضرت فاطمہ (س) کی تجہیز و تکفین کے بعد جب آپ کے وفادار شوہر حضرت علی گھر واپس گئے تو بے حد افسردہ تھے اور بار بار یہ اشعار پڑھ رہے تھے

اری علل الدنیا علی کثیرۃ	وصاحبھا حتی الممات علیل
لکل اجتماع من خلیلین فرقۃ	وکل الذی دون الفراق قلیل
وان افتقادی فاطمۃ بعد احمد	دلیل علی ان لا یدوم خلیل

یقیناً میں دیکھتا ہوں کہ (فاطمہ کی وفات کے بعد) دنیا کی بیماریوں اور مصائب نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا ہے اور اہل دنیا مرنے تک بیمار رہتے ہیں۔ ہر اصل و یک جائی کے بعد دو دوستوں میں مفارقت ہونا ضروری ہے، اور وہ زمانہ جو جدائی کے بغیر ہوتا ہے (یعنی زمانہ وصل) بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد فاطمہؑ کی مفارقت اس بات کی دلیل ہے کہ دوست ہمیشہ نہیں رہتا۔[1]

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراؑ کی فقید المثال سیرت و صفات کے پیش نظر علامہ اقبالؒ تحریر فرماتے ہیں کہ ان کی حیات طیبہ تمام مسلمان عورتوں کے لئے تا قیامت ایک اسوۂ کاملہ ہے جس کی انہیں پیروی کرنی چاہئے۔ مندرجہ ذیل اشعار خاص طور پر قابل غور ہیں

مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز	از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
جنابِ مریم از حضرت عیسیٰ کا ایک ہی تعلق سے محترم تھیں	لیکن حضرت فاطمۃ الزہرا تین تعلقات سے محترم ہیں
نورِ چشمِ رحمۃ للعالمین	آں امام اولین و آخرین
وہ رحمۃ للعالمین کی نورِ چشم یعنی دختر ہیں	جو مخلوقات میں اولین و آخرین کے امام تھے

[1] الزہراءؑ تالیف عمر ابو النصر ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی ص ۹۳ تا ۹۵

آں کہ جاں در پیکر گیتی دمید — روزگار تازہ آئیں آفرید

وہ نبی الرحمت جس نے پیکرِ عالم میں روحِ تازہ پھونکی — اور ایک نئے دستورِ شرعی کے ساتھ نئی دنیا پیدا کی

بانوے آں تاجدار ھل اتیٰ — مرتضیٰ، مشکل کشا، شیرِ خدا

بعد ازاں وہ حضرت علی کی زوجہ ہیں — وہ کہ مرتضیٰ، مشکل کشا، اور شیرِ خدا ہیں

پادشاہ و کلبۂ ایوان او — یک حسام و یک زرہ سامانِ او

وہ کہ بادشاہ ہو کر بھی جھونپڑی ہی ان کا محل تھا — اور اور زرہ ان کا سامان تھا

مادر آں مرکز پرکار عشق — مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

بعد ازاں وہ مرکزِ پرکارِ عشق کی والدہ ہیں — اور کارواں سالارِ عشق کی محترم والدہ

آں یکے شمع شبستانِ حرم — حافظ جمعیت خیر الامم

وہ کہ شبستانِ حرم کی شمعِ ضیا پاش تھے — اور امتِ محمدیہ کے اتحاد کے محافظ تھے

تا نشیند آتش پیکار و کیں — پشتِ پا زد بر سرِ تاج و نگیں

اس لئے کہ جنگ اور عداوت کی آگ بجھ جائے — انہوں نے تاج و تخت کو بھی ٹھکرا دیا

واں دگر مولائے ابرار جہاں — قوتِ بازوے احرار جہاں

اور وہ دوسرا فرزند کہ تمام ہستی کو کارواں کا دستہ تھا — اور دنیا کے حریت پسند لوگوں کی قوت بازو

در نوائے زندگی سوز از حسینؓ — اہلِ حق حریت آموز از حسینؓ

زندگی کے نغمے میں سوز حسینؓ ہی سے ہے — اور اہلِ حق اسی سے حریت کا سبق پڑھتے ہیں

سیرتِ فرزندہا از امہات — جوہرِ صدق و صفا از امہات

سچ پوچھو تو بیٹوں کی سیرت ماؤں ہی سے بنتی ہے — اور ان میں جوہرِ صدق و صفا مائیں ہی پیدا کرتی ہیں

مزرع تسلیم را حاصل بتولؑ — مادراں را اسوہ کامل بتولؑ

اطاعت کی کھیتی کا حاصل فاطمۃ الزہرا ہیں — اور تمام مسلمان ماؤں کے لیے اسوہ کامل ہی ہے

بہر محتاجے دلش آں گونہ سوخت — با یہودے چادر خود را فروخت

ایک سائل کے لیے ان کا دل اس قدر نرم ہوا — کہ اس کی خاطر یہودی کے پاس اپنی چادر بیچ دی

نوری و ہم آتشی فرمانبرش — گم رضائش در رضائے شوہرش

نوری یا ناری مخلوق ان کی فرمانبردار ہے — اور ان کی رضا تو رضائے شوہری میں گم تھی

آں ادب پروردۂ صبر و رضا — آسیا گرداں و لب قرآں سرا

انہوں نے صبر و رضا سے درس تہذیب پایا تھا — اور چکی پیستے ہوئے بھی تلاوت قرآن فرماتی تھی

گریہ ہائے او ز بالیں بے نیاز — گوہر افشاندے بدامانِ نماز

وہ محض تکیے پر اپنے آنسو نہیں گراتی تھیں — بلکہ ان کے گوہر اشک جائے نماز پر بکھر جاتے تھے

اشک او بر چید جبریلؑ از زمیں — ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں

یہ گوہر اشک جبرائیل زمین سے چن لیتا تھا — اور پھر عرش بریں پر انہیں شبنم کی طرح بکھیرتا تھا

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست — پاس فرمان جناب مصطفےٰ است

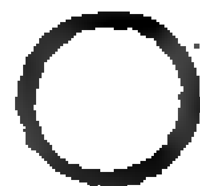
آئین حق کا رشتہ مجھے زنجیر پا ہو رہا ہے — اور توحید سے متعلق فرمان مصطفےٰ کا پاس ہے

ورنہ گرد تربتش گردیدمے

ورنہ میں ان کے مزار کا پیہم طواف کرتا

سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اور ان کی خاک پہ پے در پے سجدے کرتا



عبداللہ المعالی رضی اللہ

امام حسین علیہ السلام



قتل حسینؓ اصل میں مرگِ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

(مولانا محمد علی جوہر)

اہلِ کوفہ کی دعوتِ بیعت پر جب حضرت حسینؓ اہل بیت اور رفقا سمیت میدانِ کربلا میں وارد ہوئے، اور حالات کو توقعات کے برعکس پایا، تورات کے وقت آپ اپنے ساتھی جمع کئے اور خطبہ فرمایا:۔

اللہ تعالیٰ کی حمد و ستائش کرتا ہوں۔ رنج و راحت ہر حالت میں اس کا شکرگزار ہوں۔ الٰہی تیرا شکر کہ تو نے ہمارے گھر کو نبوت سے مشرف کیا، قرآن کا فہم عطا کیا، دین میں سمجھ بخشی، اور دیکھنے سننے اور عبرت پکڑنے کی قوتوں سے سرفراز کیا۔ امابعد۔ لوگو! میں نہیں جانتا کہ آج روئے زمین پر میرے ساتھیوں سے

افضل اور بہتر لوگ بھی موجود ہیں۔ یا میرے اہل بیت سے زیادہ ہمدرد، مخلص اور بہی خواہ اہل بیت کس کے ساتھ ہیں۔ اے لوگو! تم سب کو اللہ تعالیٰ میری طرف سے جزائے خیر دے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کل میرا اور ان کا فیصلہ ہو جائے گا۔ غور و فکر کے بعد میری رائے یہ ہے کہ تم سب خاموشی سے نکل جاؤ۔ رات کا وقت ہے۔ میرے اہل بیت کا ہاتھ پکڑو اور تاریکی میں ادھر اُدھر چلے جاؤ۔ میں خوشی سے تمہیں رخصت کرتا ہوں۔ میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ یہ لوگ صرف مجھے چاہتے ہیں۔ میری جان لے کر تم سے غافل ہو جائیں گے۔"

یہ سن کر آپ کے اہل بیت بہت رنجیدہ اور بے چین ہوئے۔ حضرت عباسؓ نے کہا: "یہ کیوں؟ کیا اس لئے کہ ہم آپ کے بعد زندہ رہیں؟ خدا ہمیں وہ دن نہ دکھائے۔" حضرت نے مسلم بن عقیل کے رشتہ داروں سے کہا: "اے اولادِ عقیل! مسلم کا قتل کافی ہے۔ اب تم چلے جاؤ۔ میں نے تمہیں اجازت دی۔" وہ کہنے لگے: "ہمارے چلے جانے پر لوگ کیا کہیں گے؟ — یہی کہیں گے کہ ہم اپنے شیخ، سردار اور عم زادوں کو چھوڑ کر بھاگ آئے۔ ہم نے ان کے ساتھ نہ کوئی تیر پھینکا، نہ نیزہ چلایا، اور نہ تلوار چلائی۔ نہیں! واللہ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ ہم تو آپ پر جان، مال، آل اولاد سب کچھ قربان کر دیں گے۔ آپ کے ساتھ ہو کر لڑیں گے۔ جو آپ پر گذرے گی وہی ہم پر گذرے گی۔ آپ کے بعد خدا ہمیں زندہ نہ رکھے۔"

آپ اور آپ کے ساتھیوں نے پوری رات نماز، استغفار اور دعا و تضرع میں گزار دی۔ راوی کہتا ہے: "دشمن کے سوار رات بھر ہمارے لشکر کے گرد چکر لگا رہے تھے۔ حضرت حسینؓ بلند آواز سے یہ آیت پڑھ رہے تھے:۔

اَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْا اِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ۝ مَا کَانَ اللّٰهُ لِیَذَرَ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی مَا اَنْتُمْ عَلَیْهِ حَتّٰی یَمِیْزَ الْخَبِیْثَ مِنَ الطَّیِّبِ

ترجمہ۔ کیا کافر و منکر یہ خیال کئے ہوئے ہیں کہ ہمارے ڈھیل دینے میں ان کی بہتری اور بھلائی مضمر ہے؟ ہم صرف اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ ان کا جرم اور زیادہ ہو جائے اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ خدا مومنین کو اسی حالت میں چھوڑ رکھنے والا نہیں۔ وہ پاک کو ناپاک سے الگ کر دکھائے گا۔"

دسویں محرم کی نماز فجر کے بعد عمر بن سعد اپنی فوج لے کر نکلا۔ حضرت حسینؑ نے بھی اپنے اصحاب کی صفیں قائم کیں۔ ان کے ساتھ صرف ۳۲ سوار اور ۴۰ پیدل، کل ۷۲ آدمی تھے۔ میمنہ پر زہیر بن القین کو مقرر کیا، علم اپنے بھائی عباس بن علیؑ کے ہاتھ میں دے دیا۔ خیمے کے پیچھے خندق کھود کر اس میں بہت سا ایندھن وغیرہ بھر دیا گیا، اور آگ جلا دی گئی تاکہ دشمن پیچھے سے حملہ آور نہ ہو سکے۔ اتنے میں دشمن کی فوج سے شمر ذی الجوشن گھوڑا دوڑاتا ہوا آپ کے لشکر کے گرد پھرا، اور آگ کو دیکھ کر چلایا:۔

"اے حسینؑ! قیامت سے پہلے ہی تم نے آگ قبول کر لی؟" حضرت نے جواب دیا۔ "چرواہے کے لڑکے! تو ہی آگ کا زیادہ مستحق ہے۔" مسلم بن عوسجہ نے عرض کیا "مجھے اجازت دیجئے کہ اسے تیر مار کر ہلاک کر ڈالوں، کیونکہ بالکل زد پر ہے۔" حضرت نے منع کیا اور فرمایا "نہیں میں لڑائی میں پہل نہیں کروں گا۔"

دشمن کا رسالہ آگے بڑھتے دیکھ کر آپ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے "الٰہی ہر مصیبت میں تجھی پر میرا بھروسہ ہے، ہر سختی میں تو ہی میرا پشت پناہ ہے۔ کتنی مصیبتیں

پڑیں، دل کمزور ہو گیا، تدبیر نے جواب دے دیا، دوست نے بے وفائی کی، دشمن نے خوشیاں منائیں، مگر میں نے تجھی سے التجا کی، اور تو نے ہی میری دستگیری فرمائی! تو ہی ہر نعمت کا مالک ہے، تو ہی احسان و کرم فرمانے والا ہے آج بھی تجھی سے التجا کی جاتی ہے!"

جب دشمن قریب آگیا تو آپ نے اونٹنی طلب کی، سوار ہوئے، قرآن سامنے رکھا اور دشمن کی صفوں کے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے یہ خطبہ دیا:۔

"لوگو! میری بات سنو، جلدی نہ کرو، مجھے نصیحت کر لینے دو۔ اپنا عذر بیان کرنے دو۔ اپنی آمد کی وجہ کہنے دو، اگر میرا عذر معقول ہوا اور تم اسے قبول کر سکو اور میرے ساتھ انصاف کرو، تو یہ تمہارے لئے خوش نصیبی کا باعث ہوگا، اور تم میری مخالفت سے باز آجاؤ گے۔ لیکن اگر سننے کے بعد بھی تم میرا عذر قبول نہ کرو، اور انصاف کرنے سے انکار کر دو، تو پھر مجھے کسی بات سے بھی انکار نہیں تم اور تمہارے ساتھی ایکا کر لو، مجھ پر ٹوٹ پڑو، مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو، میرا اعتماد ہر حال میں صرف پروردگارِ عالم پر ہے، اور وہ نیکوکاروں کا حامی ہے۔"

آپ کی اہل بیت نے یہ کلام سنا تو شدتِ تاثر سے بے اختیار ہو گئیں، اور خیمہ سے آہ و بکا کی صدا بلند ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی عباسؓ اور اپنے فرزند علی کو بھیجا تاکہ انہیں خاموش کرائیں، اور کہا "ابھی انہیں بہت رونا باقی ہے" پھر بے اختیار پکار اٹھے "خدا ابن عباس کی عمر دراز کرے" راوی کہتا ہے یہ جملہ اس لئے آپ کی زبان سے نکلا کہ مدینہ میں عبداللہ بن عباسؓ نے عورتوں کو ساتھ لے جانے سے منع کیا تھا، مگر آپ نے اس پر توجہ نہ کی تھی۔ اب ان کا جزع فزع سنا تو عبداللہ بن عباس کی بات یاد آگئی۔ پھر آپ نے از سرِ نو تقریر شروع کی:۔

"لوگو! میرا حسب ونسب یاد کرو۔ سوچو کہ میں کون ہوں، اور کن ہستیوں کی اولاد ہوں۔ پھر اپنے گریبانوں میں منہ ڈالو، اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو، خوب غور کرو، کیا تمہارے لئے میرا قتل کرنا اور میری حرمت کا رشتہ توڑنا روا ہے؟ کیا میں تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑکی کا بیٹا، اور اس کے عم زاد حضرت علی کا بیٹا نہیں ہوں؟ کیا سید الشہداء حضرت حمزہؓ میرے باپ کے چچا نہ تھے؟ کیا ذوالجناحین حضرت جعفر طیار میرے چچا نہیں ہیں؟ ــــ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول نہیں سنا کہ آپ میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرماتے ہیں سیدا اسباب اھل الجنۃ یعنی "یہ دونوں جنت میں نوجوانوں کے سردار ہیں") اگر میرا یہ بیان سچا ہے اور ضرور سچا ہے، کیونکہ واللہ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد آج تک کبھی جھوٹ نہیں بولا، تو بتلاؤ کیا تمہیں برہنہ تلواروں سے میرا استقبال کرنا چاہیے؟ اگر تم میری بات پر یقین نہیں کرتے، تو تم میں ایسے لوگ موجود ہیں جن سے تصدیق کر سکتے ہو۔ جابر بن عبداللہ انصاری سے پوچھو، ابو سعید خدری سے پوچھو، سہیل بن سعد ساعدی سے پوچھو، زید بن ارقم سے پوچھو، انس بن مالک سے پوچھو۔ وہ تمہیں بتلائیں گے کہ انہوں نے میرے اور میرے بھائی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے یا نہیں۔ ــــ کیا رسول اللہ کا یہ ارشاد بھی تمہیں میرا خون بہانے سے باز نہیں رکھ سکتا؟ ــــ واللہ اس وقت روئے زمین پر بجز میرے کسی نبی کی لڑکی کا بیٹا موجود نہیں۔ میں تمہارے نبی کا بلاواسطہ نواسہ ہوں۔ کیا تم

اس لئے مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہو کہ میں نے کسی کی جان لی ہے؟ کسی کا خون بہایا ہے، کسی کا مال چھینا ہے؟ کہو کیا بات ہے، آخر میرا قصور کیا ہے؟ آپ نے بار بار پوچھا مگر کسی نے جواب نہیں دیا پھر آپ نے بڑے بڑے کوفیوں کے نام لے کر پکارنا شروع کیا: "اے اشعب بن ربعی! اے حجاب بن الجبر! اے قیس بن اشعث! اے یزید بن حارث! کیا تم نے مجھے نہیں لکھا تھا کہ پھل پک گئے، زمین سرسبز ہو گئی، نہریں ابل رہی ہیں۔ آپ آئیں گے تو اپنی فوج جرار کے پاس آئیں گے لہذا جلد آیئے؟"
یہ سن کر ان لوگوں کی زبانیں کھلیں، اور انہوں نے کہا: "ہرگز نہیں ہم نے تو نہیں لکھا تھا۔" آپ چلا اٹھے "سبحان اللہ! یہ کیا جھوٹ ہے، واللہ تم ہی نے لکھا تھا۔" بعد ازیں آپ نے پھر پکار کر کہا: "اے لوگو! چونکہ تم اب مجھے ناپسند کرتے ہو، اس لئے بہتر ہے کہ مجھے چھوڑ دو، میں یہاں سے واپس چلا جاتا ہوں۔" یہ سن کر قیس بن اشعث نے کہا: "کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اپنے آپ کو اپنے عم زادوں کے حوالے کر دیں وہ وہی برتاؤ کریں گے جو آپ کو پسند ہے۔ آپ کو ان سے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔" آپ نے جواب دیا: "تم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہو۔ اے شخص! کیا تو چاہتا ہے کہ بنی ہاشم تجھ سے مسلم بن عقیل کے علاوہ ایک اور خون کا بھی مطالبہ کریں؟ نہیں، واللہ! میں ذلت کے ساتھ اپنے آپ کو ان کے حوالے نہیں کروں گا۔"

عدی بن حرملہ سے روایت ہے کہ ابن سعد نے جب فوج کو حرکت دی، تو حر بن یزید نے کہا: "خدا آپ کو سنوارے! کیا آپ اس شخص سے واقعی لڑیں گے؟" ابن سعد نے جواب دیا: "ہاں، واللہ لڑائی! ایسی لڑائی جس میں کم از کم یہ ہو گا کہ سر

کٹیں گے، اور ہاتھ شانوں سے اُڑ جائیں گے۔ حرؑ نے کہا "کیا ان تین شرطوں میں سے کوئی ایک بھی قابلِ قبول نہیں، جو اس نے پیش کی ہیں؟" ابن سعد نے جواب دیا "بخدا اگر مجھے اختیار ہوتا تو ضرور منظور کر لیتا۔ مگر کیا کروں، تمہارا حاکم منظور نہیں کرتا۔" حرؑ بن یزید یہ سن کر اپنی جگہ پر لوٹ آیا۔ اس کے قریب خود اس کے قبیلہ کا بھی ایک شخص کھڑا تھا۔ اس کا نام قرہ بن قیس تھا۔ حرؑ نے اس سے کہا "تم نے اپنے گھوڑے کو پانی پلا لیا؟"

بعد میں قرہ کہا کرتا تھا کہ حر کے اس سوال ہی سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ امام حسینؑ کے خلاف لڑائی میں شریک نہیں ہونا چاہتا، اور مجھے وہاں سے ٹالنا چاہتا ہے تاکہ میں اس کی شکایت حاکم سے نہ کروں۔" یہ سوچتے ہوئے میں نے جواب دیا "نہیں میں نے اپنے گھوڑے کو پانی نہیں پلایا ہے۔ میں ابھی جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں دوسری طرف روانہ ہو گیا۔ میرے الگ ہونے ہی حرؑ نے امام حسینؑ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنا شروع کیا۔ یہ دیکھ کر اس کے قبیلہ کے ایک شخص مہاجر بن اوس نے کہا۔ "کیا تم حسینؑ پر حملہ کرنا چاہتے ہو؟" حرؑ خاموش ہو گیا۔ مہاجر کو شک ہوا اور کہنے لگا۔ "تمہاری خاموشی مشتبہ ہے۔ میں نے کبھی کسی جنگ میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ کوفہ میں سب سے بہادر کون ہے؟ تو تمہارے نام کے سوا کوئی اور نام میری زبان پر نہیں آ سکتا۔ پھر تم اس وقت یہ کیا کر رہے ہو؟" حرؑ نے سنجیدگی سے جواب دیا، "بخدا میں جنت یا دوزخ کا انتخاب کر رہا ہوں۔ واللہ! میں نے جنت کا انتخاب کر لیا ہے، چاہے میں اس لڑائی میں شہید کیوں نہ کر دیا جاؤں۔" یہ کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر لشکرِ حسینؑ میں پہنچ گیا۔

حضرت امام حسینؓ کی خدمت میں پہنچ کر حرؓ نے کہا: "ابنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں ہی وہ بدبخت ہوں جس نے آپ کو لوٹنے سے روکا، راستہ بھر آپ کا پیچھا کیا، اور اس جگہ اترنے پر مجبور کیا۔ خدا کی قسم! میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ یہ لوگ آپ کی شرطیں منظور نہ کریں گے، اور آپ کے معاملہ میں اس حد تک پہنچ جائیں گے۔ واللہ اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایسا کریں گے، تو میں ہرگز اس حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ میں اپنے قصوروں پر نادم ہو کر توبہ کے لئے آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں آپ کے قدموں پر قربان ہونا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کے خیال میں یہ اقدام و عمل میری توبہ اور بخشش کے لئے کافی نہیں ہوگا؟" حضرت نے محبت و مودت سے فرمایا: "ہاں اللہ تعالیٰ تیری توبہ کو قبول فرمائے، تجھے بخش دے۔ تیرا نام کیا ہے؟" اس نے کہا "حر بن یزید" فرمایا: "تو حر یعنی آزاد ہی ہے جیسا کہ تیری ماں نے تیرا نام رکھ دیا ہے، تو دنیا اور آخرت میں انشاء اللہ حر ہے۔"

بعد ازیں حرؓ دشمن کی صفوں کے سامنے پہنچا اور کہا: "اے لوگو! حسینؑ کی پیش کی ہوئی شرطوں میں سے کوئی شرط منظور کیوں نہیں کر لیتے تاکہ خدا تمہیں اس امتحان سے بچا لے؟" وہ بولے: "یہ ہمارے سردار عمر بن سعد موجود ہیں، یہی جواب دیں گے۔" عمر نے کہا: "میری دلی خواہش تھی کہ ان کی شرطیں منظور کر سکتا۔" اس کے بعد حرؓ نے نہایت جوش و خروش سے تقریر کی، اور اہل کوفہ کو ان کی بدعہدی اور غداری پر شرم و غیرت دلائی۔ لیکن اس کے جواب میں انہوں نے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ حرؓ یہ دیکھ کر مجبوراً خیمہ کی طرف لوٹ آیا۔

اس واقعہ کے بعد عمر بن سعد نے اپنی کمان اٹھائی اور لشکر حسینؑ کی طرف یہ کہہ

تیر پھینکا، گواہ رہو، سب سے پہلا تیر میں نے چلایا ہے۔" پھر تیر باری ہر جانب شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد زیاد بن ابیہ، اور عبیداللہ بن زیاد کے غلام یسار و سالم میدان میں نکلے اور مبارزت طلب کی۔ قدیم طریق جنگ میں مبارزت کا طریقہ تھا کہ فریقین کے لشکر سے ایک ایک جنگ آزما نکلتا، اور پھر دونوں باہم دگر بھڑ جاتے۔ چنانچہ لشکر حسینؑ سے حبیب بن مظاہر اور بریر بن حضیر نکلنے لگے، مگر حضرت حسینؑ نے انہیں منع کیا۔ عبداللہ بن عمیر الکلبی نے کھڑے ہو کر عرض کیا "مجھے اجازت دیجئے کہ مبارزت کے لئے نکلوں۔" یہ شخص اپنی بیوی کے ساتھ حضرت کی حمایت کے لئے کوفہ سے چل کر آیا تھا۔ سیاہ رنگ، تنومند اور کشادہ سینہ تھا۔ آپ نے اس کی صورت دیکھ کر فرمایا: "بے شک یہ مرد میدان ہے۔" اور اجازت دے دی۔ عبداللہ نے چند پھیروں میں دونوں حریف زیر کر کے قتل کر ڈالے۔ اس کی بیوی ام وہب ہاتھ میں لاٹھی لئے کھڑی تھی، اور جنگ کی ترغیب دیتی تھی۔ پھر یکایک اسے اس قدر جوش آیا کہ میدانِ جنگ کی طرف بڑھنے لگی۔ حضرت حسینؑ یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور فرمایا: "اہل بیت کی طرف سے خدا تمہیں جزائے خیر دے، لیکن عورتوں کے ذمہ لڑائی نہیں۔"

اس کے بعد ابن سعد کے میمنہ نے حملہ کیا۔ جب بالکل قریب پہنچ گئے تو حضرت کے رفقاء زانو پر گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو گئے، اور نیزے سیدھے کر دیئے۔ نیزوں کے منہ پر گھوڑے بڑھ نہ سکے اور لوٹنے لگے۔ حضرت کی فوج نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھایا اور تیر باری کر کے بہت سے آدمی قتل اور زخمی کر دیئے۔ اب باقاعدہ جنگ جاری ہو گئی۔ طرفین سے منتخب جوان نکلتے تھے اور تلوار کے جوہر دکھلاتے تھے۔ حضرت حسینؑ

کے طرف داروں کا پلّہ بھاری تھا۔ جو بھی ان کے سامنے آتا تھا، مارا جاتا تھا۔ میمنہ کے سپہ سالار عمرو بن الحجاج نے یہ حالت دیکھی تو پکار اٹھا

بے وقوفو! پہلے تم یہ جان لو کہ کس سے لڑ رہے ہو؟ یہ لوگ جان پر کھیلے ہوئے ہیں تم اسی طرح ایک ایک کر کے قتل ہوتے جاؤ گے۔ ایسا نہ کرو، یہ مٹھی بھر ہیں۔ انہیں تو پتھروں سے مار سکتے ہو۔ عمرو بن سعد نے یہ رائے پسند کی اور حکم دیا کہ مبارزت موقوف کی جائے، اور عام حملہ شروع ہو۔ چنانچہ میمنہ آگے بڑھا، اور کشت و خون شروع ہو گیا۔ ایک گھڑی بعد لڑائی رکی تو نظر آیا کہ حسینی فوج کے نامور بہادر مسلم بن عوسجہ خاک و خون میں پڑے ہیں۔ حضرت حسین دوڑ کر لاش پاس پہنچے ابھی سانس باقی تھا، آہ بھر کر فرمایا: "مسلم تجھ پر خدا کی رحمت!" مسلم بن عوسجہ اس جنگ میں آپ کی جانب سے پہلے شہید تھے۔

لڑائی اپنی پوری ہولناکی سے جاری تھی۔ اب دوپہر ہو گئی، مگر کوئی فتح غلبہ حاصل نہ کر سکی وجہ یہ تھی کہ لشکر امام مجتمع تھا اور حسینی فوج نے تمام خیمے ایک جگہ جمع کر دیئے تھے، جس کے سبب دشمن صرف ایک ہی رخ سے حملہ کر سکتا تھا عمر بن سعد نے یہ دیکھا تو خیمے اکھاڑ ڈالنے کے لئے آدمی بھیجے حسینی فوج کے صرف چند ہی آدمی یہاں مقابلہ کے لئے کافی ثابت ہوئے۔ وہ خیموں کی آڑ سے دشمن کے آدمی قتل کرنے لگے۔ جب یہ صورت بھی ناکامیاب رہی تو عمرو بن سعد نے خیمے جلا دینے کا حکم دیا سپاہی آگ لے کر دوڑے حسینی فوج نے یہ دیکھا تو مضطرب ہوئی، مگر حضرت حسین نے فرمایا ان کے اس فعل پر تشویش مت کرو۔ جلانے دو۔ یہ ہمارے لئے اور بھی بہتر ہے۔ اب وہ پیچھے سے حملہ نہیں کر سکیں گے۔" اور ان کے حسب ارشاد ہوا بھی یہی۔

اسی اثنا میں زہیر بن القین نے شمر پر زبردست حملہ کیا اور اس کی فوج کے قدم اکھاڑ دیئے، مگر کب تک؟ ذرا دیر کے بعد پھر دشمن کا ہجوم ہو گیا، اب حسینی لشکر کی بے بسی صاف ظاہر تھی۔ بہت سے لوگ قتل ہو چکے تھے، کئی نامی سردار مارے جا چکے تھے۔ حتیٰ کہ عبداللہ بن عمیر کلبی بھی، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، قتل ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی ام وہب بھی شہید ہو چکی تھی۔ یہ میدانِ جنگ میں بیٹھی اپنے مقتول شوہر کے چہرے سے مٹی صاف کر رہی تھی، اور یہ کہتی جاتی تھی: "تجھے جنت مبارک ہو" شمر نے جب اسے دیکھا تو قتل کروا ڈالا۔ ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ صائدی نے اپنی بے بسی کی حالت محسوس کی اور حضرت حسین سے عرض کیا: "دشمن اب بالکل آپ کے قریب آ گیا ہے۔ واللہ آپ اس وقت تک قتل نہیں ہونے پائیں گے، جب تک میں قتل نہ ہو جاؤں۔ لیکن میری آرزو ہے کہ اپنے پروردگار اور معبود سے نماز پڑھ کر ملوں، جس کا وقت قریب آ گیا ہے!"

یہ سن کر حضرت نے سر اٹھایا اور فرمایا: "دشمنوں سے کہو پہلے نماز کی مہلت دیں" مگر دشمنوں نے یہ درخواست منظور نہیں کی اور لڑائی بدستور جاری رہی۔ یہ وقت بہت سخت تھا، کیونکہ دشمن نے اپنی پوری قوت لگا دی۔ غضب یہ ہوا کہ حسینی میسرہ کے سپہ سالار حبیب بن مظاہر بھی قتل ہو گئے۔ گویا فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ ان کے بعد ہی حر بن یزید کی باری تھی۔ وہ جوش میں رجزیہ اشعار پڑھتے ہوئے دشمن کی صفوں میں گھس پڑے، اور دشمنانِ حسین کو قتل کرنے لگے۔ چند لمحوں کی بات تھی، حر زخموں سے چور ہو کر گرے اور جان بحق تسلیم ہو گئے۔ اب ظہر کا وقت ختم ہو رہا تھا، حضرت نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دشمن کا دباؤ اور بھی زیادہ ہو گیا۔ اس موقع پر آپ کے میسرہ کے سپہ سالار زہیر بن القین نے میدان اپنے ہاتھ لے لیا۔

ور یہ شعر پڑھتے ہوئے دشمن پر ٹوٹ پڑے۔

انا زھیر وانا ابن القین　　　اذودھم بالسیف عن حسین

"میں زہیر ابن القین ہوں۔ میں اپنی تلوار کی نوک سے انہیں حسین سے دور کر دوں گا۔"

پھر دشمن کی طرف لپٹے اور انہیں قتل کرتے رہے، یہاں تک کہ خود شہید ہو گئے

اب آپ کے ساتھیوں نے دیکھا کہ دشمن کو روکنا ناممکن ہے چنانچہ انہوں نے طے کیا کہ آپ کے سامنے ایک ایک کر کے قتل ہو جائیں۔ لہذا دو غفاری بھائی آگے بڑھے اور لڑنے لگے، حتیٰ کہ عشق حسینؑ وہ بھی شہید ہو گئے۔

ان کے بعد دو جابری لڑکے سامنے آ گئے۔ دونوں بھائی تھے اور زار و قطار رو رہے تھے۔ حضرت نے انہیں دیکھا تو فرمانے لگے "اے میرے بھائی کے فرزندو! کیوں روتے ہو۔ ابھی چند لمحوں بعد تمہاری آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی۔" انہوں نے شکستہ آواز میں عرض کیا۔ "ہم اپنی جان کی فکر میں نہیں روتے، بلکہ ہم آپ کی موجودہ کیفیت پر روتے ہیں۔ دشمن نے آپ کو گھیر لیا ہے، اور ہم آپ کے کسی کام نہیں آ سکتے۔" پھر دونوں نے بڑی شجاعت سے لڑنا شروع کیا۔ وہ بار بار چلاتے تھے

"السلام علیک یا ابن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم!"

ان کی شہادت کے بعد حنظلہ بن اسعد حضرت کے سامنے آ کر کھڑے ہوئے اور باآواز بلند انہیں مخاطب کیا: "اے قوم! میں ڈرتا ہوں کہ عاد و ثمود کی طرح تمہیں بھی عذاب الٰہی کا روز بد نہ دیکھنا پڑے۔ میں ڈرتا ہوں کہ تم برباد نہ ہو جاؤ۔ اے قوم! حسینؑ کو قتل نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ خدا تم پر اپنا غضب اور عذاب نازل کر دے۔"

لیکن ان کے نصائح پر عمل کرنے کی بجائے انہیں بھی شہید کر دیا گیا۔

الغرض یکے بعد دیگرے تمام اصحاب قتل ہو گئے۔ اب بنی ہاشم اور خاندان کی باری تھی۔ سب سے پہلے آپ کے صاحبزادے علیؑ اکبر میدان میں آئے اور دشمن پر حملہ کیا۔ ان کا رجز یہ تھا۔

"میں علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ ہوں۔ قسم رب کعبہ کی کہ ہم قرب نبیؐ کے زیادہ حقدار ہیں۔ قسم خدا کی نامعلوم باپ کے لڑکے کا بیٹا (یزید) ہم پر حکومت نہیں کر سکے گا" وہ بڑی شجاعت کے ساتھ لڑے۔ بالآخر مرہ بن منقذ العبدی کی تلوار سے شہید ہو گئے۔ ایک راوی کہتا ہے میں نے دیکھا کہ خیمہ سے ایک عورت تیزی کے ساتھ نکلی وہ اتنی حسین تھی جیسے طلوع کرتا ہوا سورج ہو۔ وہ چلا رہی تھی "آہ بھائی! آہ بھتیجے" میں نے پوچھا یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہا کہ یہ زینب بنت فاطمہؓ بنت رسول اللہؐ ہیں" لیکن حضرت حسینؑ نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا، اور خیمے میں پہنچا آئے پھر علیؑ کی نعش اٹھائی اور خیمے کے سامنے لاکر رکھ دی۔

ان کے بعد اہل بیت اور بنی ہاشم کے دوسرے جانفروش قتل ہوتے رہے، یہاں تک کہ میدان میں ایک جوان رعنا نمودار ہوا۔ وہ اس قدر حسین تھا کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بڑی شدت کے ساتھ دشمن پر حملہ آور ہوا۔ عمرو بن سعد ازدی نے اس کے سر پر تلوار ماری۔ نوجوان چلایا "ہائے چچا!" اور زمین پر گر پڑا۔ آواز سنتے ہی حضرت حسینؑ غضبناک شیر کی طرح قاتل پر لپکے اور تلوار کا ایک بے پناہ وار کیا جس سے اس کا نصف بازو کٹ گیا۔ زخم کھاکر قاتل نے پکارنا شروع کیا۔ فوج اسے بچانے کے لئے ٹوٹ پڑی۔ مگر گھبراہٹ میں بچانے کی بجائے اسے روند ڈالا۔ راوی کہتا ہے جب غبار چھٹ گیا تو کیا دیکھتا ہوں حضرت حسینؑ لڑکے کے سرہانے

پڑے ہیں۔ وہ ایڑیاں رگڑ رہا ہے، اور آپ فرماتے ہیں: ان کے لئے ہلاکت جنہوں نے تجھے قتل کیا ہے۔ قیامت کے دن تیرے نانا کو یہ کیا جواب دیں گے؟ بخدا تیرے چچا کے لئے یہ سخت حسرت کا مقام ہے کہ تو اسے پکارے اور وہ جواب نہ دے۔ جواب دے مگر تجھے اس کی آواز فائدہ نہ پہنچا سکے۔ میرے بھتیجے افسوس کہ تیرے چچا کے دشمن بہت ہو گئے، اور دوست باقی نہ رہے۔ اس حال میں اللہ ہی کی دوستی ہی کافی ہے! پھر لاش اپنی گود میں اٹھالی، در آں حالیکہ لڑکے کا سینہ آپ کے سینہ سے ملا ہوا تھا اور پاؤں زمین پر رگڑتے جاتے تھے آپ نے اسے لاکر علی اکبر کے پہلو میں لٹا دیا۔ راوی کہتا ہے میں نے حاضرین سے پوچھا یہ کون ہے؟ انہوں نے بتایا یہ قاسمؓ بن حسنؓ بن علی مرتضیٰؓ ہیں" عین اس وقت حضرت حسینؓ کے یہاں لڑکا پیدا ہوا، اور وہ آپ کے پاس لایا گیا۔ آپ نے اسے گود میں لیا اور اس کے کان میں اذان دینے لگے۔ اچانک ایک تیر آیا اور بچے کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ بچے کی روح اسی وقت پرواز کر گئی۔ آپ نے تیر اس کے حلق سے کھینچ کر نکالا اور خون سے چلو بھرا اور اس کے جسم پر ملنے لگے اور فرمانے لگے "واللہ تو خدا کی نظر میں حضرت صالح کی اونٹنی سے زیادہ معزز و محترم ہے۔ اور محمد ﷺ اللہ کی نظر میں حضرت صالح سے زیادہ افضل ہیں۔ الٰہی! اگر تو نے ہم سے اپنی نصرت روک لی ہے تو وہی کر جس میں بہتری ہے"

اسی طرح ایک ایک کر کے اکثر بنی ہاشم اور اہل بیت شہید ہو گئے ان سب کے بعد خود آپ کی باری تھی۔ آپ میدان میں تنہا کھڑے تھے، دشمن یلغار کر کے آتے تھے مگر وار کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ یہ گناہ عظیم دوسرے کے

مر ڈالے۔ لیکن شمر ذی الجوشن نے ساتھیوں کو برانگیختہ کرنا شروع کیا۔ ہر طرف سے آپ کو گھیر لیا گیا۔ اہل بیت کے خیمے میں عورتیں اور چند خورد سال لڑکے رہ گئے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکے نے آپ کو اس طرح گھرا دیکھا تو جوش سے بے خود ہو گیا، اور خیمہ کی لکڑی لے کر دوڑ پڑا۔ حضرت زینب کی نظر پڑ گئی تو دوڑ کر پکڑ لیا۔ حضرت حسینؓ نے دیکھ لیا اور بہن سے کہا اسے روکے رکھو۔ ادھر آنے نہ پائے۔ مگر لڑکے نے زور کر کے اپنے آپ کو چھڑا لیا اور حضرت کے پہلو میں پہنچ گیا۔ عین اسی وقت بحر بن کعب نے آپ پر تلوار اٹھائی لڑکے نے فوراً ڈانٹ بتائی "او خبیث! میرے چچا کو قتل کرے گا" سنگدل حملہ آور نے اپنی تلوار لڑکے پر چھوڑ دی۔ اس نے ہاتھ پر روکی، اور ہاتھ کٹ گیا۔ بچہ اس شدید اذیت سے چلایا۔ حضرت نے اسے سینے سے چپٹا لیا اور فرمایا "صبر کر، اسے ثواب خداوندی کا ذریعہ بنا۔ اللہ تعالیٰ تجھے بھی تیرے صالح بزرگوں تک پہنچا دے گا، رسول اللہؐ، علیؓ بن ابی طالب، حمزہؓ، جعفرؓ اور حسنؓ بن علی تک۔" اب آپ پر ہر طرف سے نرغہ شروع ہوا۔ آپ نے بھی تلوار چلانا شروع کی اور پیدل فوج پر ٹوٹ پڑے، اور تن تنہا اس کے قدم اکھاڑ دیئے۔ عبداللہ بن عمار جو خود جنگ میں شریک تھا، روایت کرتا ہے کہ میں نے نیزے سے حضرت حسینؓ پر حملہ کیا اور ان کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ اگر میں چاہتا تو قتل کر سکتا تھا مگر یہ خیال کر کے ہٹ گیا کہ گناہ اپنے سر کیوں لوں۔ میں نے دیکھا کہ دائیں بائیں حضرت پر حملے ہو رہے تھے۔ وہ جس طرف مڑ جاتے تھے دشمن کو بھگا دیتے تھے۔ واللہ میں نے کبھی کسی شکستہ دل کو جس کا تمام کنبہ اس کی آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا ہو، ایسا شجاع، ثابت قدم اور مطمئن نہیں دیکھا۔ حالت یہ تھی کہ دائیں بائیں سے دشمن اس طرح بھاگ کھڑے ہوتے

ہوتے تھے جس طرح شیر کو دیکھ دیکھ کر بکریاں بھاگ جاتی ہیں۔ دیر تک یہی حالت رہی اسی اثناء میں آپ کی بہن زینب رضؓ بنت فاطمہ رضؓ خیمہ سے باہر نکلیں، اور وہ چلا رہی تھیں "کاش، آج آسمان زمین پر ٹوٹ پڑے" یہ وہ موقعہ تھا جبکہ عمر بن سعد حضرت حسین رضؓ کے بالکل قریب آگیا۔ حضرت زینب رضؓ نے پکار کر کہا: "اے عمر! کیا ابو عبداللہ تمہاری آنکھوں کے سامنے قتل ہو جائیں گے؟"

عمر نے یہ سن کر منہ پھیر لیا، مگر اس کے رخسار اور ڈاڑھی پہ آنسوؤں کی لڑیاں بہنے لگیں۔

لڑائی کے دوران میں آپ کو بہت سخت پیاس لگی۔ آپ پانی پینے فرات کی طرف چلے، مگر دشمن کب جانے دیتا تھا۔ اچانک ایک تیر آیا اور آپ کے حلق میں پیوست ہو گیا۔ آپ نے تیر کھینچ لیا، اور ہاتھ منہ کی طرف اٹھائے اور دونوں چلو خون سے بھر گئے۔ آپ نے خون آسمان کی طرف اچھالا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ "الٰہی میرا شکوہ تجھی سے ہے۔ دیکھ! تیرے رسول کے نواسے سے کیا برتاؤ کیا جا رہا ہے؟" پھر آپ اپنے خیمے کی طرف لوٹنے لگے، تو شمر اور اس کے ساتھیوں نے یہاں بھی تعرض کیا۔ یہ دیکھ کر حضرت نے محسوس کیا کہ ان کی نیت خراب ہے اور خیمہ لوٹنا چاہتے ہیں۔ فرمایا۔ اگر تم میں دین نہیں اور تم روزِ قیامت سے نہیں ڈرتے، تو آدابِ انسانیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دنیاوی شرافت ہی پر قائم رہو۔ میرے خیمے کو اپنے جاہلوں اور اوباشوں سے محفوظ رکھو۔"

شمر نے جواب دیا۔ "اچھا ایسا ہی کیا جائے گا اور آپ کا خیمہ محفوظ رہے گا۔"

اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ راوی کہتا ہے کہ دشمن اگر چاہتا تو آپ کو بہت پہلے قتل کر ڈالتا، مگر یہ گناہ کوئی بھی اپنے سر نہ لینا چاہتا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر شمر ذالجوشن

چلا یا مد تمہارا برا ہو، کیا انتظار کرتے ہو، کیوں ان کا کام تمام نہیں کر دیتے۔" اب پھر ہر طرف سے نرغہ ہوا۔ آپ نے پکار کر کہا، تم میرے قتل پر ایک دوسرے کو کیوں ابھارتے ہو؟ واللہ میرے بعد کسی بندے کے قتل پر اللہ تعالیٰ اتنا غضبناک نہیں ہوگا، جتنا مجھ پر تمہارے ظلم و تعدی سے۔" مگر اب حالات بہت بگڑ چکے تھے، اور آپ کی نصیحت و تلقین کو کوئی نہیں سنتا تھا۔ زرعہ بن شریک تیمی نے آپ کے بائیں ہاتھ کو زخمی کر دیا۔ پھر شانے پر تلوار ماری۔ آپ کمزوری سے لڑکھڑائے۔ لوگ ہیبت سے پیچھے ہٹے۔ مگر سنان بن انس نخعی نے بڑھ کر نیزہ مارا اور آپ زمین پر گر پڑے۔ اس نے ایک شخص سے کہا سر کاٹ لے۔ وہ سر کاٹنے کے لیے بڑھا مگر جرأت نہ ہوئی۔ سنان بن انس نے غضب آلود ہو کر کہا "خدا تیرے ہاتھ شل کر ڈالے۔" پھر وہ خود جوش سے اترا اور آپ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝

"جو حضرات اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید کیے گئے، انہیں مردہ ہرگز مت کہو، بلکہ وہ تو حقیقی معنوں میں زندہ ہیں مگر تم ان کی زندگی کو سمجھ نہیں سکتے۔"

حقیقت یہ ہے کہ امام الشہداء حضرت حسین علیہ السلام اس آیۂ قرآنی کی عملی تفسیر تھے کہ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا یعنی "حق نمودار ہوا اس کے نمودار ہوتے ہی باطل فنا ہو گیا کیونکہ باطل کے لئے فنا ہونا ازل ہی سے مقدر ہے۔" انہوں نے معدودے چند اعزا اور رفقا کے ساتھ حامیان باطل کے لشکر جرار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تمام رفقا شہید ہو گئے، اہل بیت کے بچے شہید ہو گئے،

ان ایسے مایوس کن ماحول میں تن تنہارہ جانے کے باوجود ان کے صبر واستقامت، عزم وہمت اور توکل علی اللہ میں ذرہ برابر ضعف نہ آیا۔ ہاں وہ بے یار و مددگار ہو کر ان غداروں، منافقوں اور بدعہدوں کے مقابل سینہ سپر رہے، اور تادمِ واپسیں پیروانِ باطل کا مقابلہ کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ گویا جس دینِ حق میں انتہائی قربانی دے کر اس کے ناموس و تقدس کی حفاظت کی! ۔

غریب و سادہ و رنگین ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

(اقبال)

تاریخ کے اس عظیم الشان اور عبرت آموز معرکۂ حق وباطل سے واضح ہے کہ اہلِ باطل کے تو کئی مذاہب ہو سکتے ہیں، کئی طریقِ عمل ہو سکتے ہیں، کئی مسلک و مشرب ہو سکتے ہیں، جو ماحول اور دنیوی اغراض و مفادات کے تحت متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ جیسا کہ کوفہ کے غدار، بدعہد اور نام نہاد "مسلمانوں"[1] نے کیا) لیکن حق ہمیشہ ایک ہی ازلی و ابدی صورت میں قائم و دائم رہتا ہے، اور دنیا کی مادی قوتیں اپنے انتہائی ساز و سامان کے باوجود اسے مرعوب و مغلوب نہیں کر سکتیں :۔

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی!

(اقبال)

---

[1] جو درحقیقت منافقین تھے، اور تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کو جب بھی ضعف و نقصان پہنچا ہے، ایسے ہی منافقوں کے ذریعے پہنچا ہے۔

معرکۂ کربلا جو ایک اور اہم اور تعمیری پیغام ہمارے سامنے لاتا ہے، وہ یہ ہے کہ
اسلامی جمہوریت کا درس قرآن حکیم نے پے درپے دیا تھا، اور جس پر آنحضرت صلی اللہ
اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے بدرجہ اتم عمل پیرا ہو کر دکھایا، حضرت حسین ؑ نے اپنی اور اپنے
کی قربانیاں دے کر بھی اس روح جمہوریت کو زندہ و پائندہ اور فعال رکھا۔ انہوں نے
سب کچھ جس کے تصور سے بھی کلیجے دہل جاتے ہیں، خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت
لیکن یزید اور اس کے حامیوں کی آمریت اور جبر و استبداد کے سامنے سر تسلیم خم
کیا۔ اس میدان کارزار کا ذرہ ذرہ آج تک شاہد ہے کہ وہ ناموس اسلام کے
اور زندۂ جاوید محافظ تھے!

سر داد، نہ داد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ است حسین ؑ!

اسلامی جمہوریت کے حفظ و بقاء کے لئے سبط رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایک
قربانی ہے جو تا قیامت ملت کو پکار پکار کر یہ حیات افروز اور حریت آموز درس
رہے گی کہ مسلمان اپنی جان کی بازی لگا کر بھی اپنی روایتی جمہوریت کے ناموس و تقدس
کو برقرار رکھ سکتا ہے لیکن کسی بدکردار مطلق العنان آمر اور جابر و مستبد شخص کی قیادت
زمانہ داری قبول نہیں کر سکتا!

حشر تک چھوڑ گئے ایک درخشندہ مثال
حق پرستوں کو نہ بھولے گا یہ احسان حسین ؑ

(مولانا محمد علی جوہر)

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عبداللہ ذوالبجادین

قبول اسلام سے پہلے آپ کا نام عبدالعزیٰ تھا۔ ابھی شیرخوارگی کی منزل میں تھے کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ والدہ نہایت غریب تھیں، اس لیے چچا نے پرورش کا بیڑا اٹھایا۔ جب جوانی کی عمر کو پہنچے تو چچا نے اونٹ، بکریاں، غلام، سامان اور گھربار دے کر ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔ ہجرت نبوی کے بعد توحید کی صدائیں عرب کے گوشے گوشے گونجنے لگی تھیں، اور ان کے کان میں برابر پہنچ رہی تھیں چونکہ لوحِ فطرت بے میل اور شفاف تھی، اور قبولِ حق کی صلاحیت رکھتی تھی، اس لیے انہوں نے دل ہی دل میں قبول اسلام کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسلام کی صدائے حق جو عرب کے کسی بھی گوشے میں بلند ہوتی۔ ان کے لیے ذوق و شوق کا تازیانہ بن جاتی۔ قبولِ اسلام کے لیے ہر روز قدم بڑھاتے، مگر چچا کے خوف سے پھر پیچھے ہٹا لیتے۔ انہیں ہر وقت اسی کا انتظار رہتا کہ چچا اسلام کی طرف مائل ہوں تو یہ بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں

اس انتظار میں ہفتے گذرے مہینے بیتے، اور سال ختم ہو گئے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا، دین حق کا پرچم ہر طرف لہرانے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تطہیر حرم کے بعد مدینہ میں واپس تشریف لائے تھے کہ ذوالبجادین کا پیمانۂ صبر بھی لبریز ہو گیا۔ آپ چچا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "محترم چچا! میں کئی برسوں سے آپ کے قبولِ اسلام کی راہ تک رہا ہوں، مگر آپ کا حال وہی ہے، جو پہلے تھا۔ اب میں اپنی عمر پر زیادہ اعتماد نہیں کر سکتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ آستانۂ اسلام پر سر رکھ دوں۔"

ذوالبجادین کو جس بات کا خطرہ تھا، وہی پیش آگئی۔ ادھر "قبولِ اسلام" کے الفاظ ان کے ہونٹوں سے باہر نکلے، ادھر چچا آپے سے باہر ہو گیا، اور کہنے لگا اگر اسلام قبول کرو گے تو میں اپنا تمام سامان تم سے واپس لے لوں گا، تمہارے جسم سے چادر اتار دوں گا، تمہاری کمر سے تہبند تک چھین لوں گا، تم اپنی دنیا سے بالکل تہی دست کر دیئے جاؤ گے اور ایسے حال میں یہاں سے نکلو گے کہ تمہارے جسم پر کپڑے کا ایک تار بھی باقی نہیں رہے گا۔"

چونکہ آپ کے قلب و دماغ میں اسلام راسخ ہو چکا تھا، اور توحید کا نشہ کوئی ایسا نشہ نہیں تھا جو دنیوی نقصانات کے خوف یا چچا کی سرد مہری و ترش کلامی سے اتر جائے۔ لہٰذا انہوں نے بے باکی سے جواب دیا:

"اے عم محترم! میں مسلمان ضرور ہوں گا۔ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ضرور کروں گا۔ اب میں شرک و بت پرستی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ آپ کا زر و مال آپ کے لئے مبارک، اور میرا اسلام میرے لئے مبارک۔ تھوڑے دنوں تک موت ان تمام چیزوں کو مجھ سے چھڑا دے گی پھر یہ کیا برا ہے، اگر میں آج خود ہی انہیں چھوڑ دوں

آپ اپنا سب مال و اسباب سنبھال لیں۔ میں اس کے لئے دینِ حق کو قربان نہیں کر سکتا۔"

ذوالبجادین نے یہ کہا اور چچا کے تقاضے کے مطابق اپنا لباس اتار دیا۔ جوتے اتار دیئے، چادر اتار دی، اور اس کے بعد تہبند بھی اتار کر ان کے سپرد کر دیا۔ پھر چچا کے گھر سے اس طرح نکلے کہ خدائے واحد کے اسم مقدس کے سوا کوئی بھی اور چیز ساتھ نہ تھی۔

اس حال میں آپ اپنی ماں کے گھر میں داخل ہوئے۔ ماں نے انہیں مادر زاد برہنہ دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں، اور پریشان ہو کر پوچھا: "اے میرے بیٹے! تمہارا یہ حال ہے؟" ذوالبجادین نے کہا: "اے اماں! اب میں مومن و موحد ہو گیا ہوں! الحمد للہ مومن اور موحد ہو گیا ہوں" کے الفاظ ان کے حال کے کس قدر مطابق تھے کیونکہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول برحق کی خوشنودی کے لئے تمام دنیوی ساز و سامان کو مسترد کر دیا تھا، اور توحید ہی کو اپنی تمام سعادت و کامرانی کا منبع یقین کر لیا تھا۔ ماں نے پوچھا "تو اب کیا ارادہ ہے؟" کہنے لگے "اب میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جاؤں گا اور ان کے دستِ مبارک پر اسلام قبول کروں گا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ مجھے ستر پوشی کے بقدر کپڑا دے دیا جائے۔" ماں نے ایک کمبل دیا۔ آپ نے راہ میں اس کمبل کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک ٹکڑا تہبند کے طور پر باندھا، اور دوسرا چادر کے طور پر اوڑھا، اور اس طرح یہ مومن و موحد مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

بادِ سحر مسجد نبوی میں اٹکھیلیاں کر رہی تھی کہ گرد سے اٹا ہوا ذوالبجادین تاملوں کی چھاؤں میں مسجد نبوی میں داخل ہوا، اور ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر دائمی رحمت

کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز صبح کے لئے تشریف لائے۔ حضور نے صحن مسجد میں قدم رکھا تو ذوالبجادین سامنے تھا۔ فرمایا: "آپ کون؟" ذوالبجادین نے جواب دیا: "ایک فقیر اور مسافر۔ عاشق جمال اور طالب دیدار۔ میرا نام عبدالعزٰی ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ذوالبجادین کے تمام حالات سانحات سنے، اور فرمایا: "یہیں ہمارے قریب ٹھہرو اور مسجد میں رہا کرو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالعزّٰی کی بجائے عبداللہ ان کا نام رکھا۔ اور اصحاب صفہ میں شامل کر دیا۔ یہاں اللہ کا یہ موحّد بندہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ قرآن حکیم سیکھتا اور سمجھتا تھا۔ اور آیات ربانی کو بڑے ہی ولولہ اور جوش سے پڑھا کرتا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے ان کی بلند آواز قرأت سن کر ایک دفعہ فرمایا: "اے دوست اس قدر اونچی آواز سے نہ پڑھو کہ دوسروں کی نماز میں خلل واقع ہو۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا: "اے فاروق! انہیں چھوڑ دو۔ یہ تو خدا اور رسولؐ کے لئے سب کچھ چھوڑ چکا ہے۔" جب ۹ھ کو اطلاع ملی کہ عرب کے تمام عیسائی قبائل قیصر روم کے جھنڈے تلے متحد ہو گئے ہیں، اور وہ رومی فوجوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں، اس وقت عرب کی گرمی خوب زوروں پر تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آدمیوں اور روپے کے لئے اپیل کی۔ تمام اصحاب نے بقدر گنجائش زر، مال و اسباب خدمت اسلام کے لئے وقف کر دیا۔ عبداللہ ذوالبجادین کے پاس سوائے ہی خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام کے سوا کچھ بھی موجود نہ تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی پیش کر دی۔

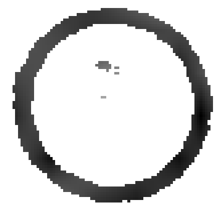
آنحضرتؐ تیس ہزار مجاہدین کی جمعیت کے ساتھ ہجوم آتشبار کے طوفانوں میں

منورہ سے روانہ ہوئے۔ سواریاں اس قدر کم تھیں کہ اٹھارہ اٹھارہ آدمیوں
حصے میں ایک ایک اونٹ آیا سامانِ رسد اس قدر قلیل تھا کہ مسلمان درختوں
پتے کھاتے تھے، اور قیصرِ روم کے مقابلے پر منزل بہ منزل چلے جا رہے تھے۔ عبداللہؓ
البجادین ولولہ جہاد سے لبریز تھا، شوقِ شہادت سے سرشار تھا اور اسی دھن میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں آیا اور کہنے لگا "یا رسول اللہؐ آپ
فرمایئے کہ میں راہ خدا میں شہید ہو جاؤں" رسول اللہؐ نے فرمایا "تم کسی درخت
چھلکا اتار لاؤ" عبداللہؓ درخت کا چھلکا لے کر خوشی خوشی حاضرِ خدمت ہوا۔ حضورؐ
چھلکا لیا اور اسے عبداللہؓ کے بازو پر باندھ دیا اور زبانِ مبارک سے فرمایا "یا اللہ!
کفار پر عبداللہؓ کا خون حرام کرتا ہوں" عبداللہؓ ارشادِ نبویؐ پر حیران سا رہ گیا اور
کہنے لگا "یا رسول اللہؐ میں تو شہادت کا آرزو مند تھا" فرمایا "جب تم راہِ خدا میں
نکل پڑے، پھر اگر بخار سے بھی مر جاؤ تو شہید ہو۔" مجاہدینِ اسلام تبوک کے مقام پر
پہنچے تھے کہ عبداللہؓ کو سچ مچ بخار آ گیا یہی بخار ان کے لئے پیغامِ شہادت تھا۔ رسول اللہؐ
کو ان کے انتقال کی خبر پہنچائی گئی تو آپؐ صحابہؓ کے ساتھ تشریف لائے۔ ابن حارثؓ
مزنی سے روایت ہے کہ رات کا وقت تھا۔ حضرت بلالؓ کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ حضرت
ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اپنے ہاتھوں سے میت کو لحد میں اتار رہے تھے۔ خود
رسول اللہؐ قبر کے اندر کھڑے تھے، اور حضرت عمرؓ سے فرما رہے تھے "اَدْنِیَا اِلَیَّ اَخَاکُمَا"
یعنی اپنے بھائی کو ادب سے لحد میں اتارو۔"

جب میت لحد میں رکھ دی گئی، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔
اینٹیں میں خود رکھوں گا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے

قبر میں اینٹیں لگائیں اور جب تدفین مکمل ہو چکی تو دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا:۔

"الٰہی! میں آج شام تک مرنے والے سے خوش رہا ہوں۔ تو بھی اس سے راضی ہو جا۔" حضرت ابن مسعودؓ نے یہ نظارہ دیکھا تو فرمایا: "اے کاش! اس قبر میں میں دفن کیا جاتا۔"





رضی اللہ عنہ

عمرو بن العاص

حضرت عمرو بن العاص کی شجاعت، تدبر اور فتوحات سے تاریخ کے صفحات لبریز ہیں۔ مصر کی فتح سراسر ان ہی کے تدبر و قیادت کا نتیجہ تھی۔ خلافت امویہ کے قیام و استحکام میں ان ہی کی سیاست کارفرما تھی۔ وہ اپنے عہد کی سیاست میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ ایک ایسے سیاسی مدبر نے موت کا کس طرح خیر مقدم کیا، ذیل کی سطور میں اس کی تفصیل ملے گی:

جب بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور آپ کو زندگی کی کوئی امید باقی نہ رہی تو اپنی فوج خاصہ کے افسر اور سپاہی طلب کئے۔ پھر لیٹے لیٹے ہی ان سے سوال کیا: "میں تمہارا کیسا ساتھی تھا؟" انہوں نے بڑی سرگرمی سے جواب دیا: "سبحان اللہ! آپ نہایت ہی مہربان آقا تھے۔ بڑی فیاضی سے ہماری مدد کرتے تھے۔ ہمیں خوش رکھتے تھے" یہ کرتے تھے، وہ کرتے تھے۔ ابن عاص نے یہ سن کر بڑی سنجیدگی سے کہا: "میں یہ سب کچھ اس لئے کرتا تھا کہ تم مجھے موت کے منہ سے بچاؤ گے، کیونکہ تم سپاہی تھے، اور میدان جنگ

میں اپنے سردار کے لیے سپر تھے۔ لیکن یہ دیکھو موت سامنے کھڑی ہے اور میرا کام تمام کر دینا چاہتی ہے۔ آگے بڑھو اور اس کو مجھ سے دور کر دو۔" سب حاضرین حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ پریشان تھے کہ کیا جواب دیں۔ اسے ابو عبداللہ! اس کے بعد انہوں نے کہا۔ "واللہ ہم آپ کی زبان سے ایسی فضول بات سننے کے ہرگز متوقع نہ تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ موت کے مقابلہ میں ہم آپ کے کچھ بھی کام نہیں آسکتے!" آہ بھری اور حسرت سے کہا۔ "واللہ یہ حقیقت میں خوب جانتا ہوں۔ واقعی تم مجھے موت سے ہرگز نہیں بچا سکتے۔ لیکن اے کاش! میں یہ بات پہلے سے سوچ لیتا۔ اے کاش میں نے تم میں سے ایک آدمی بھی اپنی حفاظت کے لئے نہ رکھا ہوتا۔ ابن ابی الحدید حضرت علیؓ کا بھلا ہو! کیا ہی خوب کہہ گیا ہے کہ "آدمی کی سب سے بڑی حفاظت خود اس کی اپنی موت ہے۔" (طبقات ابن سعد)

راوی کہتا ہے۔ "ہم عمرو بن العاص کی عیادت کو حاضر ہوئے وہ موت کی سختیوں میں مبتلا تھے۔ اچانک دیوار کی طرف منہ پھیر لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ان کے بیٹے عبداللہ نے کہا۔ "آپ کیوں روتے ہیں۔ کیا رسول اللہ آپ کو یہ بشارتیں نہیں دے چکے ہیں؟" انہوں نے بشارتیں سنائیں، لیکن ابن العاص نے روتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس سب سے افضل دولت لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰہِ کی شہادت ہے۔ مجھ پر زندگی کی تین حالتیں گذری ہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ میں اپنے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کی دشمنی نہیں رکھتا تھا۔ میری سب سے بڑی تمنا یہ تھی کہ کسی طرح قابو پاکر آپؐ کو قتل کر ڈالوں۔ اگر میں اس حالت میں اس نیت کے ساتھ مر جاتا تو یقیناً جہنمی مرتا۔ پھر ایک وقت آیا جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی

ل دی۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا یا رسول اللہ! ہاتھ بڑھائیے، میں بیعت کرتا ہوں۔" آپؐ نے دستِ مبارک دراز کیا، مگر میں نے پھر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ فرمایا "عمرو، تجھے کیا ہوا؟" میں نے عرض کیا "ایک شرط چاہتا ہوں" فرمایا "کیسی شرط؟" میں نے عرض کیا "یہ شرط کہ ماقبل زندگی کے متعلق میری تشفی ہو جائے۔" اس پر ارشاد ہوا "اے عمرو! کیا تجھے معلوم نہیں کہ اسلام اپنے سے پہلے تمام گناہ مٹا دیتا ہے؟ ہجرت بھی مٹا دیتی ہے؟ ــــ حج بھی مٹا دیتا ہے؟" (یہ ابن عاص کی مشہور روایت ہے جسے شیخین نے بھی روایت کیا ہے۔) ــــ "اس وقت میں نے اپنا حال یہ دیکھا کہ نہ تو رسول اللہ سے زیادہ مجھے کوئی دوسرا انسان محبوب تھا اور نہ رسول اللہ سے زیادہ کسی کی عزت میری نگاہ میں تھی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر کوئی مجھ سے آپؐ کا حلیہ پوچھے تو میں نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ انتہائی عظمت و ہیبت کی وجہ سے میں آپؐ کو نظر بھر کر دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر میں قربِ رسولؐ کی اس کیفیت میں مر جاتا تو میرے جنتی ہونے کی پوری امید تھی! ــــ پھر ایک زمانہ ایسا آیا جس میں ہم نے بہت اونچ نیچ کام کیے۔ میں نہیں جانتا کہ اب میرا کیا حال ہو گا۔"

پھر آپ نے حاضرین سے بطور وصیت فرمایا "جب میں مروں تو میرے ساتھ بین کرنے والیاں نہ جائیں، نہ آگ جائے[1]۔ دفن کے وقت مجھ پر مٹی آہستہ آہستہ ڈالنا۔ میری قبر سے فارغ ہو کر اس وقت تک میرے قریب رہنا جب تک جانور ذبح کر کے ان کا گوشت تقسیم نہ ہو جائے کیونکہ تمہاری موجودگی سے مجھے انس حاصل ہو گا۔ پھر میں جان لوں گا کہ اپنے پروردگار کو کیا جواب دوں۔" (طبقات ابن سعد)

---

[1] یہ عربوں کے ایام جاہلیت کی رسوم تھی۔

ان کے ہوش وحواس آخری وقت تک قائم تھے۔ معاویہ بن خدیج عیادت کو گئے
دیکھا نزع کی حالت ہے۔ پوچھا کیا حال ہے؟ آپ نے جواب دیا شدائد نزع سے
رہا ہوں۔ بگڑتا زیادہ ہوں، بنتا کم ہوں۔ اس صورت میں اس بوڑھے کا بچنا کیونکر
(عقد الفرید وابن سعد)

حضرت عبداللہ ابن عباس عیادت کو آئے، سلام کیا، طبیعت پوچھی کہنے لگے
اپنی دنیا کم بنائی، مگر دین زیادہ بگاڑ لیا۔ اگر میں نے اسے بگاڑا ہوتا جسے سنوارا ہے،
اسے سنوارا ہوتا جسے بگاڑا ہے، تو یقیناً میں بازی لے جاتا۔ اگر مجھے اختیار ملے تو
اسی چیز کی آرزو کروں بلکہ محاسبہ اعمال سے بچ سکوں تو ضرور بھاگ جاؤں۔ اس وقت
میں مخلیس کی طرح آسمان اور زمین کے درمیان معلق ہو رہا ہوں۔ نہ اپنے ہاتھوں
کے زور سے اوپر چڑھ سکتا ہوں، نہ پیروں کی قوت سے نیچے اتر سکتا ہوں۔ اے
بھتیجے! مجھے کوئی ایسی نصیحت کر جس سے فائدہ اٹھاؤں۔" ابن عباسؓ نے جواب
دیا" اے عبداللہ اب وقت کہاں؟ آپ کا بھتیجا تو خود بوڑھا ہو کر آپ کا بھائی بن
گیا ہے۔ اگر آپ رونے کے لئے کہیں تو میں حاضر ہوں۔ جو مقیم ہے وہ سفر کا کیونکر یقین
سکتا ہے؟ عمرو بن العاص یہ جواب سن کر بہت افسردہ خاطر ہو گئے اور کہنے لگے:
کیسی سخت گھڑی ہے۔ اس وقت اسی برس سے زیادہ کا سن۔ اے عباس! تو مجھے
کی رحمت سے ناامید کرتا ہے؟ ــــ الٰہی تو مجھے خوب تکلیف دے! یہاں تک کہ تیرا
دور ہو جائے، اور تیری رضامندی لوٹ آئے!"

ابن عباس نے کہا" ابو عبداللہ! آپ نے جو چیز لی تھی، وہ تو نئی تھی، اور اب
چیز دے رہے ہو، وہ پرانی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟" اس پر آزردہ خاطر ہو گئے، اور کہا:" ابن

کیوں پریشان کرتے ہو؟ جو بات کرتا ہوں اسے کاٹ دیتے ہو۔"

عمرو بن العاص زندگی میں اکثر کہا کرتے تھے "مجھے ان لوگوں پر تعجب ہے جن کے ہوش و حواس موت کے وقت درست ہوتے ہیں، مگر موت کی حقیقت بیان نہیں کرتے۔" لوگوں کو ان کی یہ بات یاد تھی جب وہ خود اس مرحلہ پر پہنچے تو حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہ مقولہ یاد دلایا۔ عمرو بن العاص نے ٹھنڈی سانس لی اور جواب دیا "جان من! موت کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔ موت کی کیفیت ناقابل بیان ہے۔ لیکن میں اس وقت صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا آسمان زمین پر ٹوٹ پڑا ہے، اور میں دونوں کے درمیان پڑ گیا ہوں۔" (الکامل۔ جلد ۱)

گویا میری گردن پر رضوی پہاڑ رکھا ہے۔ گویا میرے پیٹ میں کھجور کے کانٹے بھر دیے ہیں۔ گویا میری سانس سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہے۔" (ابن سعد)

اسی حال میں انہوں نے ایک صندوق کی طرف اشارہ کر کے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا "اسے لے لو!" آپ کے بیٹے عبداللہ کا زہد مشہور ہے۔ انہوں نے کہا "مجھے اس کی ضرورت نہیں۔" عمرو نے کہا "اس میں دولت ہے۔" عبداللہ نے پھر انکار کیا۔ اس پر ہاتھ مل کر کہنے لگے: "کاش! اس میں سونے کی بجائے بکری کی مینگنیاں ہوتیں۔" جب بالکل آخری وقت آگیا، تو انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا دیے، مٹھیاں کس لیں، اور دعا کے لیے یہ کلمات زبان پر تھے: "الٰہی! تو نے حکم دیا، اور ہم نے حکم عدولی کی۔ الٰہی! تو نے منع کیا اور ہم نے نافرمانی کی۔ الٰہی! میں بے قصور نہیں ہوں کہ میں معذرت کروں۔ طاقتور نہیں ہوں کہ غالب آجاؤں۔ اگر تیری رحمت شامل حال نہ ہوئی تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔" (ابن سعد۔ الکامل)

اس کے بعد آپ نے تین مرتبہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا اور جان بحق تسلیم ہو گئے۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہ

معاویہ بن ابی سفیان

امیر معاویہ بن ابی سفیان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ یہ عرب کا
حزم، عقل و تدبیر، اور سیاسی فہم و شعور اس دماغ میں جمع ہو گیا تھا۔ عربی کتب اد
تاریخ ان کی تدبیر و سیاست کے واقعات سے لبریز ہیں۔ تقریباً پوری زندگی اق
حکومت میں بسر ہوئی اور ہمیشہ ان کی سیاست کامیاب رہی۔ لیکن ان کی سیا
کی بدترین لغزش اور اجتہادی غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مسندِ خلافت جیسے مقدس
ذمہ دارانہ منصب کے لئے محض اپنا بیٹا ہونے کی وجہ سے یزید جیسے نااہل شخص
تعین کر دیا، جو بعد میں تمام مسلمانوں کے لئے بالعموم اور اہل بیعت کے لئے بالخص
گوناگوں فتنوں اور مصیبتوں کا باعث ہوا، اور جس کی ہوسِ اقتدار کے تحت خان
نبوت کے تقدس، امن و سکون اور دائمی احترام کو سخت صدمہ پہنچا۔

جب ان کے مرض الموت نے خطرناک صورت اختیار کر لی اور لوگوں پر

وت کے چرچے ہونے لگے) تو امیر معاویہ کو فتنہ و فساد کا اندیشہ پیدا ہوا۔ ولی عہد
یزید جیسے جبر ابن و شمشیر ولی عہد منوایا گیا) دار الخلافہ سے دور تھا، اور ابتری پیدا ہو
نے کا قوی احتمال تھا۔ بنابریں انہوں نے فوراً اپنے تیمار داروں سے کہا: "میری
آنکھوں میں خوب سرمہ لگا دو، اور سر میں تیل ڈالو" حکم کی تعمیل کی گئی۔ سرمہ اور تیل کی
ش نے بیمار چہرے میں تازگی اور شگفتگی پیدا کر دی۔ پھر انہوں نے حکم دیا "میرا بچھونا
بچھا کر دو، اور میرے پیچھے تکیے لگا کر مجھے بٹھا دو" اس حکم کی بھی تعمیل کی گئی۔ پھر کہا: "لوگوں کو
حاضری کی اجازتِ عام دو۔ سب آئیں، اور کھڑے کھڑے سلام کر کے رخصت ہو جائیں۔
کوئی بیٹھنے نہ پائے۔" لوگ اندر آنا شروع ہوئے۔ جب وہ سلام کر کے باہر جاتے، تو
آپس میں کہتے: "کون کہتا ہے کہ خلیفہ مر رہے ہیں؟ —— وہ تو نہایت تر و تازہ اور تندرست
ہیں۔ جب سب لوگ چلے گئے تو امیر معاویہ نے یہ شعر پڑھا

وتجلدی للشامتین اریھم انی لریب الدھر لا اتضعضع

یعنی "میں شماتت کرنے والوں کے سامنے اپنی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتا۔ میں
انہیں ہمیشہ یہی دکھاتا ہوں کہ زمانے کے مصائب مجھے مغلوب نہیں کر سکتے" (طبری جلد ۷)
دورانِ علالت میں قریش کی ایک جماعت عیادت کو آئی۔ امیر معاویہ نے اس کے سامنے
دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا: "دنیا، آہ دنیا اس کے سوا کچھ نہیں جسے ہم اچھی طرح
دیکھ چکے ہیں، اور جس کا خوب تجربہ کر چکے ہیں۔ خدا کی قسم ہم اپنی جوانی کے عالم میں بہار دنیا کی
طرف دوڑے اور اس کے خوب مزے لوٹے، مگر ہم نے دیکھ لیا کہ دنیا نے بہت جلد پلٹا
کھایا اور بالکل کایا پلٹ دی۔ اس نے ایک ایک کر کے سہارے تمام توہمات کی
گرہیں کھول ڈالیں۔ پھر کیا ہوا؟ —— دنیا نے ہم سے بے وفائی کی، ہماری جوانی چھین

لی اور ہمیں بوڑھا بنا دیا۔ آہ! یہ دنیا کتنی خراب جگہ ہے۔ یہ دنیا کیسا برا مقام ہے"!

(احیاء علوم الدین۔ جلد ۶)

امیر معاویہ نے اپنی بیماری میں آخری خطبہ یہ دیا۔

"اے لوگو! میں اس کھیتی کی بالی ہوں جو کٹ چکی ہے۔ مجھے تم پر حکومت ملی تھی، اگر میرے بعد جتنے حاکم آئیں گے وہ مجھ سے برے ہوں گے ٹھیک اسی طرح جیسے اگلے حکام مجھ سے بہت اچھے تھے"!

جب وقت آخر ہوا تو کہا "مجھے بٹھا دو" چنانچہ بٹھا دیے گئے۔ دیر تک ذکر میں مصروف رہے۔ پھر رونے لگے اور کہا:-

"معاویہ! تو اپنے رب کو اب یاد کرتا ہے، جبکہ بڑھاپے نے کسی کام کا نہیں رکھا اور جسم کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ اس وقت کیوں خیال نہ آیا جب شباب کی ڈالی ترو تازہ اور ہری بھری تھی"؟

پھر چلا کر روئے اور دعا کی "اے رب! اس سخت دل گنہگار اور بوڑھے پر رحم کر۔ الٰہی اس کی لغزشیں اور ٹھوکریں معاف کر دے، اس کے گناہ بخش دے، اور اپنے وسیع حلم کو اس کے شامل حال کر جس نے تیرے سوا کسی سے امید نہیں کی، تیرے سوا کسی پر بھروسہ نہیں کیا"!

ان کی دونوں بیٹیاں ان کی تیمارداری کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ انہیں بغور دیکھ کر کہا تم ایک ڈانواں ڈول وجود کو کروٹیں بدلوا رہی ہو۔ اس نے دنیا بھر کے خزانے جمع کر لیے لیکن کاش وہ دوزخ میں نہ ڈالا جائے"۔

وفات سے پیشتر امیر معاویہ نے اشعب بن رمیلہ کے اشعار پڑھے جو اس

نباح کی مدح میں کہے تھے، اور جن کا ترجمہ درج ذیل ہے :-

۱۔ تیری موت کے ساتھ دنیا میں سخاوت اور فیاضی بھی مر جائے گی۔

۲۔ سائلوں کے ہاتھ لوٹا دیئے جائیں گے، اور دین و دنیا کی محرومیاں ان کی انتظار میں ہوں گی۔

یہ سن کر لڑکیاں چلا اٹھیں "ہرگز نہیں، امیر المومنین، ہرگز نہیں! خدا آپ کو سلامت رکھے!"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا، اور ایک اور شعر پڑھا جس کا مفہوم ہے :-

"جب موت اپنے ناخن گاڑ دیتی ہے تو کوئی تعویذ بھی نفع نہیں پہنچاتا۔"

پھر بے ہوش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد آنکھ کھولی، اور اپنے عزیزوں کو دیکھ کر کہا۔ "اللہ عزوجل سے ڈرتے رہنا، کیونکہ جو اس سے ڈرتا ہے، خدا اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس شخص کے لئے کوئی پناہ نہیں جو خدا سے بے خوف ہے۔" (طبری)

یزید کی آمد :-

امیر معاویہ کی نازک حالت سے قاصد کے ذریعہ ولی عہد یزید کو مطلع کیا گیا۔ وہ فوراً روانہ ہوا۔ پہنچتے پہنچتے ان کی حالت اور بھی ابتر ہو چکی تھی۔ اس نے باپ کو پکارا، مگر وہ بول نہ سکے۔ یزید رونے لگا اور دو حزنیہ شعر پڑھے جن کا مطلب یہ ہے کہ :-

۱۔ اگر کوئی آدمی بھی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتا، تو بلاشبہ یہ آدمیوں کا امام زندہ رہتا۔ وہ نہ عاجز ہے، نہ کمزور ہے۔

۲۔ وہ بڑا ہی عاقل و مدبر و فہیم ہے، لیکن موت کے وقت کوئی تدبر کسی کام نہیں آیا۔

معاویہ نے یہ سن کر آنکھیں کھول دیں، اور کہا۔

"اے فرزند! مجھے جس بات پر خدا سے سب سے زیادہ خوف ہے، وہ تجھ سے میرا برتاؤ ہے۔ جانِ پدر! ایک مرتبہ میں رسول اللہ صلعم کے ساتھ سفر میں تھا جب آپ ضروریات سے فارغ ہوئے یا وضو کرتے تو میں دستِ مبارک پر پانی ڈالتا۔ آپ نے میرا کرتہ دیکھا۔ وہ مونڈھے سے پھٹ گیا تھا۔ فرمایا: "معاویہ! تجھے میں کرتہ پہنا دوں؟" میں نے عرض کیا: میں آپ پر قربان، ضرور پہنایئے! چنانچہ آپ نے کرتہ عنایت کیا، مگر میں نے اسے ایک مرتبہ سے زیادہ نہیں پہنا۔ وہ میرے پاس اب تک موجود ہے۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بال ترشوائے۔ میں نے تھوڑے سے بال اور کترے ہوئے ناخن اٹھا لئے تھے۔ وہ بھی آج تک میرے پاس شیشی میں رکھے ہیں۔ دیکھ جب میں مر جاؤں تو غسل کے بعد یہ بال اور ناخن میری آنکھوں کے حلقوں اور نتھنوں میں رکھ دینا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کرتہ بچھا کر مجھے اس پر لٹا دینا، اور کفن پہنانا۔ اگر مجھے کسی چیز سے نفع پہنچ سکتا ہے، تو وہ یہی ہے۔"

(استیعاب۔ عقد الفرید)

سکراتِ موت کی حالت میں یہ شعر زبان پر جاری تھا۔

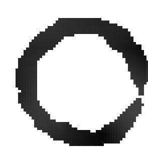
فهل من خالد اما هلکنا   فهل بالموت یا للناس عار

یعنی اگر ہم مر جائیں گے تو کیا کوئی بھی ہمیشہ زندہ رہے گا؟ ۔۔۔ کیا موت کسی کے لئے کوئی عیب ہے؟"

عینِ وفات کے وقت ان کے الفاظ یہ تھے

"کاش میں نے کبھی سلطنت نہ کی ہوتی۔ کاش میں لذتیں حاصل کرنے میں اندھا نہ ہوتا۔ کاش میں اس درویش خدا پرست کی طرح ہوتا جو تھوڑے پر زندہ رہتا ہے، مگر ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتا ہے"

(عقد الفرید)



حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مسلمانوں کی ہجرت مدینہ سے کفار کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ الگ رہ کر ان کے خلاف جنگ کی پوری تیاری کریں گے، اہلِ عرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیں گے، اور جب یہ قطرہ دریا بن گیا، تو ہماری سرداری اور قیادت کا جاہ و جلال اسلام کے سیلابِ حق کے سامنے محض خس و خاشاک کی طرح بہ جائے گا۔

مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کو پہل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی قریشِ مکہ نے اپنی ہی پریشانیوں کے ماتحت خود ہی "آبیل مجھے مار" کی روش اختیار کر لی تھی۔ جب بدر اور احد کے میدانوں میں ان کی تیغ آزمائی کا زعمِ باطل بھی ختم ہو گیا تو وہ مسلمانوں کے خلاف سازش کے جال بچھانے لگے۔ انہوں نے عضل اور قارہ کے سات آدمیوں کو رسول اللہ کے پاس بھیجا، اور کہلایا: "اگر آپ ہمیں چند مبلغِ اسلام عنایت فرما دیں تو ہمارے تمام قبیلے مسلمان ہو جائیں گے۔" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عاصم بن ثابت کی ماتحتی میں کل دس بزرگ صحابہ کا وفد ان کے ساتھ بھیج دیا۔ ایک گھاٹی میں کفار کے دو سو مسلح جوان

مسلمانوں کے اس تبلیغی وفد کا انتظار کر رہے تھے جب مبلغین اسلام یہاں پہنچے تو بے نیام تلواروں سے بجلی بن کر ان کا استقبال کیا۔ مسلمان اگرچہ اشاعت قرآن کے لئے گھروں سے نکلے تھے، مگر تلواروں سے خالی نہ تھے۔ احساس خطرہ کے ساتھ ہی دو سو کے مقابلے میں دس تلواریں نیاموں سے باہر نکل آئیں، اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ آٹھ صحابی مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوئے، لیکن خبیب بن عدی اور زید بن دثنہ دونوں مجاہدین کو کفار نے محاصرہ کر کے گرفتار کر لیا۔ سفیان ہذلی انہیں مکہ لے گیا، اور یہ دونوں پیکران ایمان و صداقت نقد قیمت پر مکہ کے درندوں کے ہاتھ فروخت کر دیئے گئے۔

حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ کو حارث بن عامر کے گھر ٹھہرایا گیا، اور پہلا حکم یہ دیا گیا کہ انہیں نہ تو روٹی دی جائے اور نہ پانی۔ حارث بن عامر نے حکم کی تعمیل کی اور ان کا کھانا بند کر دیا۔ ایک دن حارث کا نو عمر بچہ چھری سے کھیلتا ہوا حضرت خبیبؓ کے پاس پہنچ گیا اس مرد صالح نے جو کئی روز سے بھوکا اور پیاسا تھا، حارث کے بچے کو گود میں بٹھا لیا، اور چھری اس کے ہاتھ سے لے کر زمین پر رکھ دی۔ جب ماں نے پلٹ کر دیکھا تو حضرت خبیبؓ چھری اور بچہ لئے ہوئے بیٹھے تھے۔ وہ عورت چونکہ مسلمانوں کے کردار سے ناواقف تھی، لہٰذا یہ حال دیکھ کر گھبرا گئی اور بے تابانہ چیخنے چلانے لگی۔ حضرت خبیبؓ نے عورت کی تکلیف و پریشانی محسوس کی تو فرمایا کہ بی بی! تم مطمئن رہو۔ میں بچے کو ذبح نہیں کرونگا مسلمان ظلم نہیں کیا کرتے!" ان الفاظ کے ساتھ ہی خبیبؓ نے گود کھول دی، معصوم بچہ اٹھا، اور دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔

قریش نے چند روز انتظار کیا کہ یہ دونوں مسلمان اپنے دین سے برگشتہ ہو کر ان میں

مل جائیں گے۔ مگر جب فاقہ کشی کے احکام اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے، تو قتل کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا کھلے میدان میں ایک ستون نصب تھا، اور یہ اپنی بے بسی پر رو رہا تھا اس کے چاروں طرف بے شمار آدمی ہتھیار سنبھالے کھڑے تھے ان میں سے بعض تلواریں چمکا رہے تھے، بعض نیزے تان رہے تھے، بعض کمان میں تیر جوڑ کر نشانہ ٹھیک کر رہے تھے، کہ آواز آئی "خبیبؓ آ رہا ہے" مجمع میں شور برپا ہو گیا۔ لوگ ادھر ادھر دوڑنے لگے بعض لوگوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے اور حملہ کرنے اور خون بہانے کے لئے تیار ہو گئے۔

مردِ صالح خبیبؓ جب تشریف لائے، تو انہیں صلیب کے نیچے کھڑا کر دیا گیا ایک شخص نے انہیں مخاطب کیا اور کہا "خبیب! ہم تمہاری مصیبت سے دردمند ہیں۔ اگر اب بھی اسلام چھوڑ دو تو جان بخشی ہو سکتی ہے۔"

حضرت خبیبؓ خطاب کرنے والے کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا "جب اسلام ہی باقی نہ رہا، تو پھر جان بچانا بیکار ہے" اس جواب میں ایمانِ محکم اور عزم و استقامت کی جو فقید المثال روح تھی، وہ بجلی کی طرح کفار کے خرمنِ باطل پر گری مجمع ساکت ہو گیا، اور حاضرین پیروانِ اسلام کے خلوص بے باکی اور للہیت سے دم بخود رہ گئے۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا "خبیب! کوئی آخری آرزو ہے تو بیان کرو" حضرت خبیب نے فرمایا "دو رکعت نماز ادا کر لینے کے علاوہ کوئی آرزو نہیں" مجمع سے آوازیں آئیں بہت اچھا، نماز سے فارغ ہو لو" حضرت خبیب کا قلب حق پرست جو عشق الٰہی کی بے پایاں لذتوں میں ڈوب چکا تھا، زندگی

کی آخری نماز کے سوز و سرور میں ایسا محو ہوا کہ وقت کی قیود باطل ہو گئیں، اور نماز اچھا خاصا طول پکڑ گئی۔ لیکن عقل مصلحت کیش نے انہیں روکا، اور ایک ایسی آواز میں، جسے صرف شہیدوں کی روح ہی سن سکتی ہے، انہیں روح اسلام کی سے یہ پیغام دیا کہ اگر نماز زیادہ لمبی کرو گے، تو کفار یہ سمجھیں گے کہ مسلمان موت سے ڈر گیا ہے۔ اس پیغام حق کے ساتھ ہی حضرت خبیبؓ نے دائیں طرف گردن موڑ دی اور کہا "السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کفار اگرچہ نہیں بولے، مگر ان کی کھینچی ہوئی تلوار نے جواب دیا "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" پھر آپ نے بائیں طرف گردن موڑی اور السلام علیکم ورحمۃ اللہ" کفار اب بھی خاموش رہے، مگر نیزوں کی انیاں اور تیروں کی زبانیں رو رو کر پکاریں: "اے مجاہد اسلام! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ" ساتھ ہی نے انہیں معبود برحق کی جانب سے وہ مژدہ عظیم سنایا جو صرف ارواح شہداء کے مخصوص و مقدر ہے!

مرد مجاہد خبیبؓ سلام پھیر کر صلیب کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ کفار نے انہیں پھانسی کے ستون کے ساتھ جکڑ دیا اور پھر نیزوں اور تیروں کو دعوت دی کہ وہ آگے بڑھیں اور ان کے صدق ایمان اور صبر و استقامت کا امتحان لیں۔ ایک شخص آگے آیا اور اس نے خبیبؓ مظلوم کے جسم پاک کے مختلف حصوں پر نیزے سے ہلکے ہلکے چرکے لگائے اور وہی خون اطہر جو چند ہی لمحے پیشتر حالت نماز میں شکر و سپاس کے آنسو بن کر آنکھوں سے بہا تھا، اب زخموں کی آنکھ سے شہادت کے مشکبو قطرے بن کر ٹپکنے لگا۔ پیکر صبر و رضا خبیبؓ کے دردناک مصائب کا تصور کیجیے، آپ ستون کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ کبھی ایک تیر آتا ہے اور دل کے پار ہو جاتا ہے، کبھی نیزہ لگتا ہے

اور سینے کو چیر جاتا ہے۔ ان کی آنکھیں آتے ہوئے تیروں کو دیکھ رہی ہیں، ان کے عضو عضو سے خون بہ رہا ہے، مگر درد و اذیت کی اس انتہا میں بھی ان کا دل اسلام سے منحرف نہیں ہوتا۔ اتنے میں ایک اور شقی القلب آگے آیا اور اس نے حضرت خبیبؓ کے جگر پر نیزے کی انی رکھ دی، پھر اس قدر دبایا کہ وہ کمر کے پار ہو گئی۔ یہ جو کچھ ہوا اسے حضرت خبیبؓ کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اور جسم کا ذرہ ذرہ محسوس کر رہا تھا، مگر ہونٹوں سے آہ تک نہیں کی۔ حملہ آور نے کہا "اب تو تم یہ پسند کرو گے کہ محمدؐ یہاں لگ جائیں، اور تم اس مصیبت سے چھوٹ جاؤ۔" حضرت خبیبؓ نے ہتھیاروں کے سر چوکے کو دل کی حوصلہ مندی سے برداشت کر لیا تھا، مگر زبان کا یہ گھاؤ برداشت نہ ہو سکا۔ اگرچہ زبان کا خون نچڑ چکا تھا، مگر جوشِ ایمان نے اس خشک لوتھڑے میں بھی تابِ گویائی پیدا کر دی، اور آپ نے جواب دیا "اے ظالم! خدا جانتا ہے کہ مجھے جان دینا پسند ہے مگر یہ پسند نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ایک کانٹا بھی چبھے!"

نماز کے بعد تا دمِ آخر حضرت خبیب پر جو حالتیں گزریں، آپ بے ساختہ شعروں میں انہیں ادا فرماتے رہے۔ ان اشعار کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

۱۔ لوگ انبوہ در انبوہ میرے گرد کھڑے ہیں۔ قبیلے، جماعتیں، اور جتھے، یہاں سب کی حاضری لازم ہو گئی ہے!

۲۔ یہ تمام اجتماع اظہارِ عداوت کے لئے ہے، یہ سب لوگ میرے خلاف اپنے جوش و انتقام کی نمائش کر رہے ہیں، اور مجھے یہاں موت کی کھونٹی سے باندھ دیا گیا ہے

۳۔ ان لوگوں نے یہاں اپنی عورتیں بھی بلا رکھی ہیں اور بچے بھی، اور مجھے ایک مضبوط

اور اونچے ستون کے پاس کھڑا کر دیا گیا ہے۔

۴۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر میں اسلام سے انکار کر دوں تو یہ مجھے آزاد کر دیں گے مگر میرے لیے ترکِ اسلام سے قبولِ موت بہت زیادہ آسان ہے۔ اگرچہ میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، مگر میرا دل بالکل پُرسکون ہے۔

۵۔ میں دشمن کے سامنے گردن نہیں جھکاؤنگا، میں فریاد نہیں کرونگا، میں ان سے خوفزدہ نہیں ہونگا، اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف جا رہا ہوں

۶۔ میں موت سے نہیں ڈر سکتا، اس لیے کہ موت بہر حال آنے والی ہے مجھے صرف ایک ہی ڈر ہے، اور وہ دوزخ کی آگ کا ڈر ہے۔

۷۔ مالکِ عرش نے مجھ سے اسلام کی خدمت لی ہے، اور مجھے صبر و ثبات کا حکم دیا ہے اب کفار نے زدوکوب سے میرے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا ہے اور زندگی کے متعلق میری تمام امیدیں ختم ہو گئی ہیں۔

۸۔ میں اپنی عاجزی، بے وطنی اور بے بسی کی اللہ سے فریاد کرتا ہوں۔ تمہیں معلوم، میری موت کے بعد ان کے کیا ارادے ہیں۔ جو بھی صورتِ حال ہو، جب میں راہِ حق میں جان دے رہا ہوں، تو مجھے ان کے طرزِ سلوک کی پرواہ نہیں۔

۹۔ مجھے اللہ کی ذات سے امید ہے کہ وہ میرے گوشت کے ایک ایک ٹکڑے کو برکت عطا فرمائے گا۔ یا اللہ! جو کچھ آج میرے ساتھ ہو رہا ہے، اپنے رسولِ برحق کو اس کی اطلاع پہنچا دے۔

حضرت سعید بن عامر حضرت عمر فاروق کے عامل تھے۔ بعض اوقات آپ کو بیٹھے بیٹھے دورہ پڑتا اور آپ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑتے۔ ایک دن حضرت فاروقؓ

پوچھا کہ آپ کو یہ کیا مرض ہے؟" جواب دیا: "میں بالکل تندرست ہوں۔ اور
ے کوئی مرض نہیں ہے۔ جب حضرت خبیبؓ کو پھانسی دی گئی تھی تو میں اس
ع میں موجود تھا۔ جب وہ ہوش ربا واقعات یاد آتے ہیں تو مجھ سے سنبھلا
یں جاتا، اور میں کانپ کر بے ہوش ہو جاتا ہوں۔"



رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عبداللہ بن زبیر

والد کا اسم گرامی حضرت زبیر بن عوام، والدہ حضرت اسماءؓ، نانا حضرت صدیق اکبرؓ، خالہ حضرت عائشہ صدیقہؓ، پھوپھی حضرت خدیجہ، دادی حضرت صفیہؓ۔ ان رشتوں سے بھی آپ کی اسلامی اور روحانی عظمت و سیادت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے! مدینہ منورہ میں تولد ہوئے سات آٹھ برس کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کی سعادت حاصل ہوئی ۱۲ سال کی عمر تھی کہ جنگ یرموک میں شامل جہاد ہوئے۔ فتح طرابلس ۲۶ھ ہجری آپ کے حسن تدبر کا نتیجہ تھی جنگ جمل میں حضرت عائشہ صدیقہ کی حمایت میں کھل کر لڑے جنگِ صفین میں غیر جانبدار رہے۔

اسی اثنا میں مروان کے جانشین عبدالملک نے اطرافِ شام میں بہت بڑی قوت پیدا کر لی، اور قبل اس کے کہ ابن زبیر شام پر فوج کشی کرتے، عبدالملک نے عراق پر حملہ بول دیا اور گورنر کوفہ کو شکست دے کر عراق پر قابض ہو گیا۔ اب عبدالملک اس قابل تھا کہ وہ ابن

یے آخری فیصلہ کرے۔ اپنے اسی خیال کے ماتحت ایک دن اس نے ایک بہت بڑا مجمع کیا، اور ایک گرم جوش تقریر کے بعد مجمع عام سے پوچھا: "تم میں سے کون ہے جو ابن زبیرؓ کے قتل کا بیڑا اٹھائے؟"

حجاج بولا: "یہ خدمت میں سرانجام دوں گا۔" عبدالملک نے دوبارہ پوچھا: "کوئی ایسا مردِ میدان ہے، جو ابنِ زبیر کو ختم کر دے؟" حجاج بولا: "یہ خدمت میرے سپرد کی جائے میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔" چنانچہ یہ خدمت حجاج کے سپرد کر دی گئی، اور وہ ۷۲ھ ہجری میں ایک فوجِ گراں کے ساتھ مکہ معظمہ پر حملہ آور ہوا۔ حضرت ابن زبیرؓ حرم کعبہ میں پناہ گزین تھے۔ حجاج نے حرم کو چاروں طرف گھیرا، اور آتش زنی اور سنگ باری کا بے پناہ سلسلہ جاری کر دیا۔ گولے حرم کعبہ میں گر کر اس طرح پھٹتے تھے، جیسے دو پہاڑ ٹکر کھاتے ہیں، اور ٹکرا کر پرزے پرزے ہو جاتے ہیں۔ ابن زبیرؓ بڑے سکون و اطمینان سے آگ اور پتھروں کی برسات کا مقابلہ کرتے رہے، یہاں تک کہ کئی مہینے ختم ہو گئے۔ جب نماز کا وقت آتا تو آپ صحن کعبہ میں قبلہ رو کھڑے ہو جاتے۔ آپ کے چاروں طرف پتھروں کی برسات شروع رہتی، مگر آپ اسے گرد و غبار سے زیادہ اہمیت نہ دیتے۔ یہاں تک کہ رسد بالکل ختم ہو گئی، اور فوج سواری کے گھوڑوں کو ذبح کر کھانے لگی۔ مکہ معظمہ میں قحط نے اس قدر شدت اختیار کر لی کہ ہر در و دیوار سے درد و فریاد کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ابن زبیرؓ کے ساتھی فاقہ کشی کے عذاب سے تنگ آ کر روزانہ بھاگتے تھے، اور حجاج کی صفوں میں شامل ہو جاتے تھے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یہ تعداد دس ہزار تک پہنچ گئی۔ ابن زبیرؓ کے دو لختِ جگر حمزہ اور حبیب بھی ان سے الگ ہو گئے اور حجاج کے ساتھ مل گئے۔ تیسرے بیٹے نے بہادرانہ مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں شہید ہو گیا۔

اب ابن زبیرؓ اپنی والدہ حضرت اسماؓ بنت ابوبکر صدیقؓ کی خدمت میں مشورہ کے لیے حاضر ہوئے۔ اس وقت حضرت اسماؓ کی عمر سو برس سے زیادہ تھی جسم ریشہ مسام تھا، ان کے قلب و جگر پر اتنے ہی داغ تھے۔ بیٹے نے کہا: "اماں میرے تمام رفقاء اور میرے بیٹے میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ صرف چند بندگان صدق و وفا باقی ہیں، مگر وہ حملے کا جواب نہیں دے سکتے۔ دوسری طرف دشمن ہمارے مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہا۔ ان حالات میں آپ کا مشورہ کیا ہے؟" حضرت اسماؓ نے جواب دیا: "بیٹا اگر تم حق پر ہو تو جاؤ اور حق کی حفاظت کے لیے جان دے دو جس کی خاطر تمہارے بہت سے ساتھی قربان ہو چکے ہیں۔ لیکن اگر تم حق پر نہیں ہو، تو پھر تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ تم اپنی اور دوسرے لوگوں کی ہلاکت کے ذمہ دار بن رہے ہو۔" ابن زبیرؓ نے کہا: "اس وقت میرے تمام ساتھی مجھے چھوڑ گئے ہیں۔" یہ سن کر حضرت اسماؓ بولیں: "ساتھیوں کی عدم رفاقت شریف اور دیندار انسانوں کے لیے کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ غور کرو کہ تمہیں اس دنیا میں کب تک رہنا ہے۔ حق کے لیے جان دے دینا حق کو پس پشت ڈال کر زندہ رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔" ابن زبیرؓ بولے: "مجھے اندیشہ ہے کہ بنی امیہ کے لوگ میری لاش کو مثلہ کریں گے۔ مجھے سولی پر لٹکا دیں گے، اور کسی بھی بے حرمتی سے کوتاہی نہیں کریں گے۔" حضرت اسماؓ نے کہا "بیٹا! جب بکری ذبح ہو جائے تو پھر کھال اتارنے سے اس کو تکلیف نہیں ہوا کرتی۔ اچھا اب میدان جنگ کو سدھارو اور اللہ تعالیٰ سے امداد طلب کر کے اپنا فرض ادا کرو۔" ابن زبیرؓ نے ماں کے سر پر بوسہ دیا اور کہا "اے مادر محترم میں اللہ کی راہ میں کمزور ثابت نہ ہوں گا۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کو اطمینان دلا دوں کہ آپ کے بیٹے نے امر باطل پر جان نہیں دی۔" حضرت اسماؓ بولیں "بیٹا! میں تو بہر حال صبر و شکر ہی سے کام لوں گی۔ اگر تم مجھ سے پہلے

ل بیٹے تو میں صبر کروں گی۔ اگر کامیاب واپس لوٹے تو میں تمہاری کامیابی پر خوش ہوں گی
پہ اب تم قربانی دو۔ انجام خدا کے ہاتھ میں ہے" ابن زبیرؓ بولے میرے حق میں دعائے خیر
فرما دیجئے۔"

حضرت اسماءؓ نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے "اے اللہ! میں اپنے بیٹے کو تیرے سپرد
کرتی ہوں۔ تو اسے استقامت دے، اور مجھے صبر و شکر کی توفیق عطا فرما!" ابن زبیرؓ نے کہا
تمہاری یہ آخری ملاقات ہے، آج میری زندگی کا آخری دن ہے، اور پھر سر جھکائے
آگے بڑھے۔ دردمند ماں نے حوصلہ مند بیٹے کو گلے سے لگایا اور بوسہ دیا، پھر فرمایا
بیٹا! اپنا فرض پورا کر دو" ابن زبیرؓ اس وقت زرہ پہنے ہوئے تھے۔ حضرت اسماءؓ کو جب
زرہ کی کڑیاں محسوس ہوئیں تو ان کے دل پہ ایک دھچکا سا لگا۔ آپ نے تعجب سے فرمایا
میرے بیٹے! یہ کیا ہے؟ اللہ کی راہ میں جان دینے والوں کا یہ طریقہ تو نہیں ہوتا" اس پر ابن زبیرؓ
کھڑے ہو گئے، زرہ اتار کر جسم سے الگ پھینک دی، اور رجز پڑھتے ہوئے تیغ بکف شامی فوج
کی طرف آئے۔ پھر اس ولولہ و جوش سے حملہ آور ہوئے کہ میدان کانپ اٹھا چونکہ شامی فوج
کی گنتی بے قیاس تھی، لہٰذا اس کے ساتھی حملے کی تاب نہ لا کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس
وقت ایک شخص نے پکار کر کہا: "ابن زبیر! پیچھے ہٹ کر حفاظت گاہ میں چلے آیئے۔" آپ نے
آواز دینے والے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا، اور للکارتے ہوئے آگے بڑھے۔ آپ نے فرمایا
میں اس قدر بزدل نہیں ہوں کہ اپنے بہادر ساتھیوں کی موت کے بعد خود اس موت سے
بھاگ نکلوں۔" ابن زبیرؓ اپنے باقی ماندہ چند ساتھیوں کے ساتھ بپھرے ہوئے شیر کی طرح
شامی فوج پر حملہ کرتے تھے، اور جس طرف اپنی تلوار لے کر مڑتے تھے صفیں الٹ جاتی
تھیں، اور راہیں صاف ہو جاتی تھیں۔ چونکہ آپ کے جسم کو زرہ کی حفاظت حاصل نہ تھی

لہذا آپ بے دریغ تلوار چلاتے تھے، اور جسم کا خون برستے ہوئے بادل کی طرح گر جاتا تھا۔ حجاج نے تمام شامی فوجوں کو حرکت دی، اپنے منتخب بہادروں کو آگے بڑھایا اور پھر اس قوت و شدت کے ساتھ حملہ کیا کہ شامی فوجیں زور کرتے ہوئے خانہ کعبہ کے دروازوں تک پہنچ گئیں۔ لیکن برتری کی باگ اب بھی ابن زبیرؓ کے ساتھیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مٹھی بھر جوان تلواروں کی بجلی اور نعرہ ہائے تکبیر کی کڑک کے ساتھ جس طرف رخ کرتے تھے، شامیوں کا ہجوم پراگندہ ہو جاتا تھا۔ یہ حال دیکھ کر حجاج بھی اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ اس نے اپنے علمبردار کو آگے بڑھایا، اور اپنے سپاہیوں کو للکارا۔ ٹھیک اسی وقت ابن زبیرؓ اپنی جگہ سے تڑپ کر اٹھے، باز کی مانند لپکے، اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ پھیر دیا، اسی اثنا میں خانہ کعبہ کے میناروں سے اذان کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اللہ اکبر سنتے ہی اس اللہ کے بندے نے تلوار نیام میں ڈال دی، اور اپنی ایک صف سپاہ حجاج کے مقابلہ میں چھوڑ کر خود مقام ابراہیم میں جا کھڑا ہوا۔

ابن زبیر جب نماز سے لوٹے تو معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھی بکھر چکے ہیں، علم چھن چکا ہے، اور علمبردار قتل ہو چکا ہے۔ اس نظارہ حسرت و یاس سے دل کا جو حال ہوا بیان میں نہیں آسکتا۔ پھر بھی یہ بے فوج کا سپہ سالار اور بے علم کا مجاہد مردانہ وار آگے بڑھا اور یہ ایک ہی جوان دس ہزار میں گھس کر تلوار چلانے لگا۔ سامنے سے ایک تیر آیا، اور اس نے ابن زبیر کا سر کھول دیا۔ ماتھا، چہرہ اور داڑھی خون سے تر ہو گئے لیکن اس وقت بھی ان کی زبان پر یہ رجز جاری تھا۔

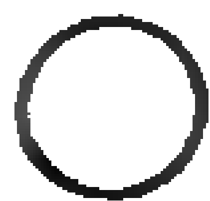
وَلَسْنَا عَلَى الْأَعْقَابِ تَدْمَى كُلُومُنَا
وَلٰكِنْ عَلٰى أَقْدَامِنَا تَقْطُرُ الدِّمَا

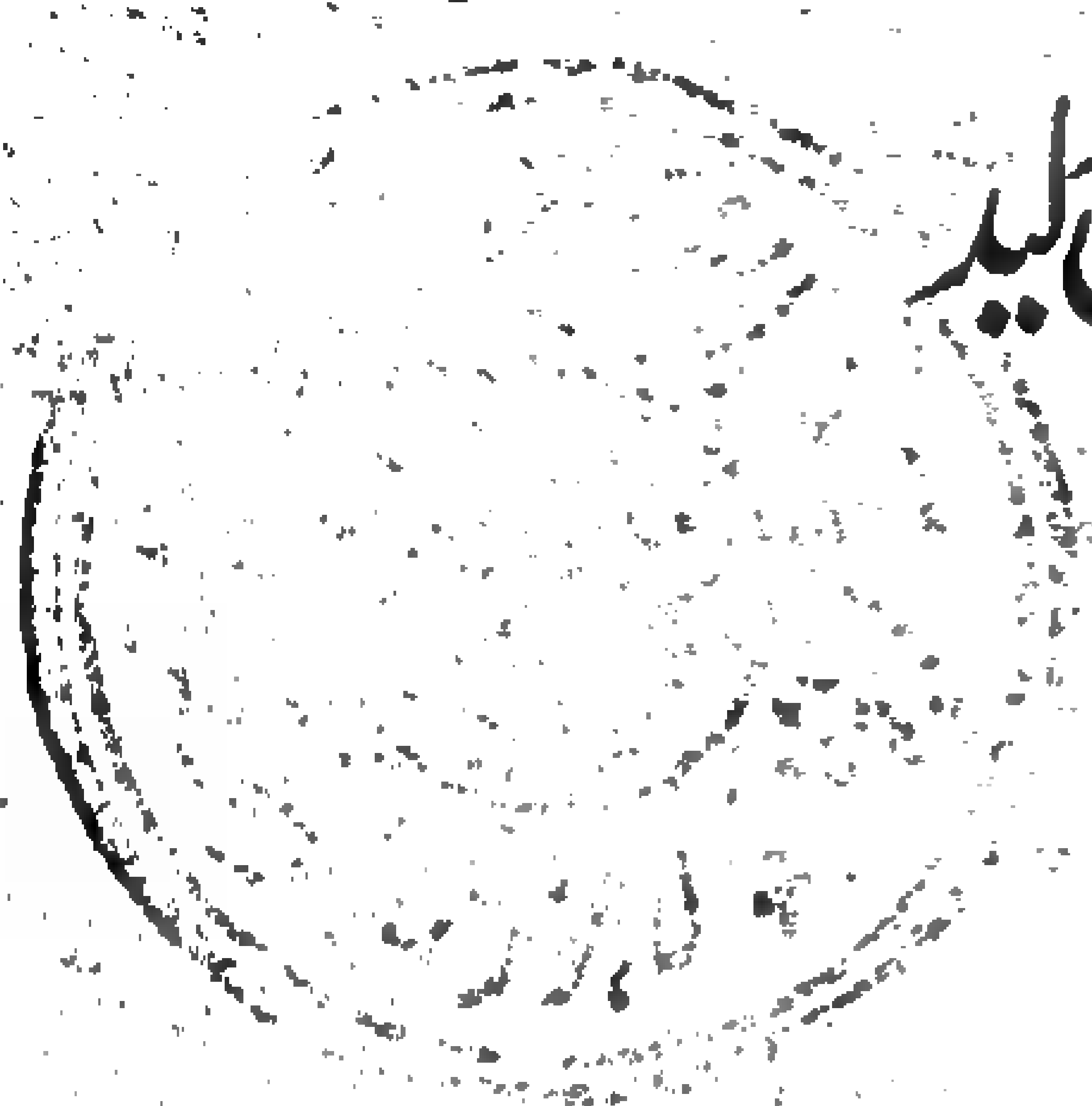
یعنی "ہم وہ نہیں ہیں کہ پیٹھ پھیرنے سے ہماری ایڑیوں پر خون گرے، بلکہ ہم وہ ہیں سینہ سپر رہتے ہیں، اور ہمارے پنجوں پر خون گرتا ہے۔"

ابن زبیرؓ رجز پڑھتے جاتے تھے، تلوار چلاتے جاتے تھے، اور آگے بڑھتے جاتے تھے ان تک کہ زمین پر گر پڑے، اور شہادت کی سعادت عظمیٰ حاصل کی۔ حجاج نے حسبِ عادہ ان کا سر کاٹ کر عبدالملک کے پاس بھیج دیا، اور ان کی لاش شہر کے باہر ایک اونچی جگہ پر لٹکا دی۔ حضرت اسماء کو اس دردناک صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو آپ نے حجاج کو پیغام بھیجا کہ "ابن زبیرؓ کی لاش کو سولی سے ہٹا دیا جائے۔" حجاج نے جواب دیا "میں اس نظارے کو قائم رکھنا چاہتا ہوں۔" حضرت اسماء نے پھر کہا "مجھے تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے۔" مگر حجاج نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ قریش یہاں آتے تھے اور اپنے نامور اور بہادر کی لاش سولی پہ دیکھ کر چلے جاتے تھے۔ ایک دن حضرت اسماء بھی ادھر سے گذریں۔ ابن زبیر کی لاش اب بھی سولی سے لٹکی کھڑی تھی آپ نے بیٹے پر نظر ڈالی اور فرمایا "کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ یہ سوار بھی اپنے گھوڑے سے اترے۔" علامہ شبلی نعمانی نے حضرت اسماء کے ان دلیرانہ الفاظ کا کس قدر اچھا ترجمہ کیا ہے :۔

لاش لٹکی رہی سولی پہ کئی دن لیکن ان کی ماں نے نہ کیا رنج والم کا اظہار
اتفاقات سے اک دن جو ادھر جا نکلیں دیکھ کر لاش کو بے ساختہ بولیں اک بار

ہو چکی دیر کہ ممبر پہ کھڑا ہے یہ خطیب
اپنے مرکب سے اترتا نہیں اب بھی یہ سوار





حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اسلام لانے کے بعد حضرت خالد بن ولید نے اپنے آپ کو ہمہ تن اسلام کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آپ کو جہاد سب سے زیادہ پسند تھا، اور کی تمام تر کوشش اسی چیز پر صرف ہوتی تھی کہ دشمنانِ دین کو چین سے نہ بیٹھنے دیا جائے فرمایا کرتے تھے کہ: "زندگی کی کوئی رات مجھے میدانِ جنگ کی سخت رات سے زیادہ محبوب نہیں جس میں میں مہاجرین کو ساتھ لے کر دشمنوں سے لڑوں۔" آپ کی شدید خواہش تھی کہ آپ کی وفات تلواروں اور نیزوں کے سائے میں ہو۔ جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا، تو بستر پر جان دینے کے خیال سے آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، اور آپ نے نہایت حسرت بھرے الفاظ میں فرمایا:

"میں ایک سو سے زائد جنگوں میں لڑا ہوں۔ میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں تلوار، تیر، یا نیزے کے زخم کا نشان نہ ہو۔ میری سب سے

بڑی خواہش یہ تھی کہ میں میدانِ جنگ میں شہادت حاصل کرتا لیکن افسوس کہ آج میں بستر پر پڑا ہوا اس طرح جان دے رہا ہوں جس طرح اونٹ جان دیتا ہے۔[1]"

بدر عینی لکھتے ہیں: "حضرت خالد بن ولید نے ۲۱ھ میں حمص میں اپنے بستر پر وفات پائی۔[2] یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ نے مدینہ میں وفات پائی۔ لیکن پہلی روایت زیادہ صحیح ہے۔"

اس ضمن میں ہم بعض ایسے بڑے بڑے لوگوں کے اقوال درج ذیل کرتے ہیں، جنہوں نے آپ کی زندگی کے ہر پہلو کا اچھی طرح مشاہدہ کیا تھا۔ ان صاحب امتیاز اور عظیم ہستیوں کے اقوال سے آپ کے اخلاق وعادات اور رجحانِ طبع کی صحیح اور روشن تصویر سامنے آجائے گی۔ یہ حضرات آپ کے ہم عصر تھے، اور انہوں نے آپ کے متعلق جو کچھ کہا، وہ اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہا۔ اس لئے ان کے اقوال ایک قطعی فیصلے کا درجہ رکھتے ہیں:-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے متعلق فرماتے ہیں: "خالد کو تکلیف نہ دو کیونکہ وہ اللہ کی تلواروں سے ایک تلوار ہے جسے اللہ نے کافروں پر گرایا ہے۔[3]"

ایک اور موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "یہ اللہ کا بندہ بھی کیا خوب آدمی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی تلواروں سے ایک تلوار ہے جسے اس نے کفار اور منافقین

---

[1] اسد الغابہ جلد ۲ صفحہ ۱۰۴۔ المعارف لابن قتیبہ صفحہ ۹۰ [2] شرح بخاری از علامہ عینی جلد ۱۶ صفحہ ۲۴۵ [3] الاستیعاب جلد اول صفحہ ۱۵۸ السیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۲۸۶

پر کھینچا ہے لہ۔"

حضرت ابوبکر صدیق کو جب الیس اور امغیشیا کے معرکوں کے دوران میں آپ کے کارناموں کا حال معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا: "اے گروہ قریش! تمہارے شیر نے ایک شیر پر حملہ کر دیا، اور اس کے بھٹ میں گھس کر اس کو مغلوب کر دیا۔ اب عورتیں خالد جیسا بہادر پیدا کرنے سے عاجز ہیں ۲ہ"

جب حضرت عمرؓ نے حضرت خالدؓ کو معزول کرنے پر اصرار شروع کیا، تو حضرت ابوبکرؓ صدیق نے فرمایا: "میں اس تلوار کو ہرگز نیام میں نہ ڈالوں گا جسے اللہ تعالیٰ نے کفار پر مسلط کیا ہوا ہے ۳ہ"

خود حضرت عمرؓ نے قنسرین کی فتح کا حال سن کر فرمایا: "اس کارنامے سے خالدؓ نے خود ہی اپنے آپ کو امیر جیوش اسلامیہ بنا لیا۔ اللہ ابوبکرؓ پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔ وہ مجھ سے زیادہ مردم شناس تھے ۴ہ"

حضرت عمرؓ نے جب حضرت خالدؓ کی خبر وفات سنی، تو فرمایا "ملّتِ اسلامیہ کی فصیل میں ایک ایسی دراڑ پڑ گئی ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکے گی ۵ہ"

حضرت عمرو بن العاص سے ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ صدیق نے حضرت خالدؓ کے بارے میں رائے دریافت کی۔ آپ نے فرمایا: "وہ جنگ کی سیاست کو خوب اچھی طرح جانتے ہیں، اور موت کی پروا مطلق نہیں کرتے۔ ان میں بلے کی سی پھرتی ہے، اور

لہ السیرۃ الحلبیۃ جلد اول صفحہ ۱۷۶ ۲ہ السیرۃ الحلبیۃ۔ جلد اول صفحہ ۱۷۶
۳ہ الطبری جلد ۴ صفحہ ۳۰ ۴ہ الطبری جلد ۴ صفحہ ۱۵۵ ۵ہ ابن عساکر صفحہ ۱۱۴

ان کا حملہ شیر کی مانند ہوتا ہے [1]

اکیدر، رئیس دومۃ نے آپ کے متعلق کہا تھا "فتح حاصل کرنے میں کوئی شخص ان سے زیادہ خوش نصیب، اور جنگی امور میں کوئی شخص ان سے زیادہ تجربہ کار نہیں ہے۔ خالد کے مقابلے میں کوئی قوم، خواہ اس کی تعداد کم ہو یا زیادہ، ٹھہر نہیں سکتی [2]"

خود حضرت خالدؓ اپنے متعلق فرماتے ہیں: "جس دن سے میں اسلام لایا، اس دن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، میرے اور دوسرے صحابہ کرام کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے تھے [3]"

ان اقوال و آثار کی موجودگی میں حضرت خالدؓ کی فقید المثال شجاعت و شہامت، عزم و اقدام، قوتِ تسخیر اور ذوق و شوقِ جہاد کی صحیح تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے، اور آپ کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے کہ "میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ میں میدانِ جنگ میں شہادت حاصل کرتا، لیکن افسوس کہ آج میں بستر پر پڑا ہوا اس طرح دم دے رہا ہوں جس طرح اونٹ جان دیتا ہے [4]"

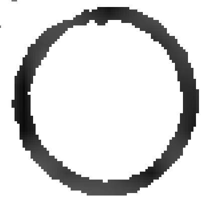
حضرت خالدؓ کے اس قول سے یہ حقیقت بھی واضح طور پر مترشح ہوتی ہے کہ آپ کو ہر سچے اور مخلص مجاہدِ اسلام کی طرح حیاتِ بعد الممات اور شہادت کے اخروی فضائل و مفادات پر، جو کلام اللہ میں جگہ جگہ مذکور ہیں، کس قدر یقینِ محکم تھا کہ دمِ واپسیں اس کی

---

[1] الیعقوبی۔ جلد ۲ صفحہ ۱۴۴ [2] اکیدر نے یہ بات اس موقع پر اپنے ساتھیوں سے کہی تھی، جب حضرت خالدؓ عیاض بن غنم کی مدد کے لئے دومۃ الجندل گئے تھے۔ [3] ابن عساکر صفحہ ۲۹۱ المسیرۃ الحلبیہ جلد ۳ صفحہ ۸۸ [4] خالد سیف اللہؓ از ابو زید شبلی۔ ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی صفحہ ۲۱۴ تا ۲۱۶

آرزو میں ماہی بے آب کی مثال تڑپ رہے ہیں۔ بلاشبہ ان کے پیش نظر وحی الٰہی کا روح پرور اعلان تھا کہ شہید فی سبیل اللہ کو مردہ ہرگز مت کہو، جو تمہارے فہم و شعور سے بالاتر ہے:۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ، بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ (البقرہ)



حضرت عمر بن عبدالعزیز
رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے صرف ڈھائی سال حکومت کی تھی۔ اس مختصر مدت خلافت میں خلق خدا نے یوں محسوس کیا کہ زمین و آسمان کے درمیان عدل و انصاف کا ترازو کھڑا ہو گیا ہے، ظلم و ستم نابود ہو گیا ہے، اور فطرتِ الٰہی خود آگے بڑھ کر انسانیت کو آزادی، محبت اور خوشحالی کا تاج پہنا رہی ہے۔ لوگ ہاتھوں میں خیرات لئے پھرتے تھے، مگر کوئی محتاج نہیں ملتا تھا۔ لوگ ناظم بیت المال کے پاس عطیات کی رقمیں بھیجتے تھے، مگر وہ عذر کرتے تھے کہ یہاں کوئی حاجت مند باقی نہیں رہا، اور عطیات کو واپس کر دیتے تھے۔ عدی بن ارطاط والی فارس نے آپ کو لکھا کہ یہاں خوشحالی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ عوام الناس کے کبر و غرور میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ ہے۔ آپ نے جواب بھیجا "وہاں کے باشندوں کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی تعلیم دینا شروع کر دو!"

آپ رات رات بھر جاگ کر موت کی جواب دہی پر غور کرتے تھے، اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑتے تھے۔ آپ کی زوجہ ہر چند آپ کو تسلی دیتی تھیں، مگر آپ کو نہیں ٹھہرتا تھا۔ حضرت نے اسی حال میں خلافت کے ڈھائی سال گذارے۔

رجب سنہ ۱۰۱ھ میں امیہ خاندان کے بعض حاسد و کینہ پرور افراد نے آپ کے غلام کو ایک ہزار اشرفی دے کر آپ کو زہر دلوا دیا۔ آپ کو اس کا علم ہوا تو غلام کو پاس بلوایا، اس سے رشوت کی اشرفیاں لے کر بیت المال میں بھجوا دیں، اور پھر فرمایا: "جا میں تمہیں اللہ کے لئے معاف اور آزاد کرتا ہوں۔" طبیبوں نے فیصلہ کیا کہ زہر کے اخراج کی صورت کی جائے، مگر آپ خلافت کی ذمہ داریوں میں ایک منٹ کا بھی اضافہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اطباء سے فرمایا: "اگر مجھے یقین ہو کہ مرض کی شفا میرے کان کی لو کے پاس ہے، تو میں پھر بھی ہاتھ بڑھا کر اسے قبضے میں نہیں لاؤں گا"

خلیفہ سلیمان نے خود ہی یزید بن عبدالملک کو آپ کا جانشین مقرر کر دیا تھا، لہٰذا آپ نے اس کے لئے حسب ذیل وصیت نامہ لکھوایا:

"اب میں آخرت کی طرف چلا جا رہا ہوں۔ وہاں اللہ تعالیٰ مجھ سے سوال کرے گا، حساب لے گا، اور میں اس سے کچھ چھپا نہیں سکوں گا۔ اگر وہ مجھ سے راضی ہو گیا تو میں کامیاب ہوں، اور اگر وہ راضی نہ ہوا تو افسوس میرے انجام پر۔ تم کو میرے بعد تقویٰ اختیار کرنا چاہیے، رعایا کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ تم بھی میرے بعد زیادہ دیر تک زندہ نہ رہو گے۔ ایسا نہ ہو کہ تم غفلت میں پڑ جاؤ، اور تلافی کا وقت ضائع کر دو۔"

سلمہ کو آپ کے اہل و عیال کا بہت خیال تھا۔ انہوں نے عرض کی "امیر المومنین!

کاش اس آخری وقت ہی میں آپ ان کے لئے کچھ وصیت فرما جائیں۔" اگرچہ آپ اس وقت بے حد کمزور تھے، پھر بھی ارشاد فرمایا "مجھے ٹیک لگا کر بٹھا دو۔" آپ کو بٹھا دیا گیا تو ارشاد فرمایا:

"خدا کی قسم! میں نے اپنی اولاد کا کوئی حق تلف نہیں کیا۔ البتہ وہ جو دوسروں کا حق تھا، ان کو نہیں دیا۔ میرا اور ان کا وارث صرف خدا ہے۔ میں ان سب کو اسی کے سپرد کرتا ہوں۔ اگر یہ اللہ تعالیٰ سے ڈریں گے اور تقویٰ اختیار کریں گے تو وہ ان کے لئے ضرور کوئی سبیل نکالے گا۔ اگر یہ گناہوں میں مبتلا ہوں گے، تو میں انہیں مال و دولت دے کر ان کے گناہوں کو قوی نہیں بناؤں گا۔"

پھر آپ نے اپنے بیٹوں کو پاس بلایا اور فرمایا:

"اے میرے عزیز بچو! دو باتوں میں سے ایک بات تمہارے باپ کے اختیار میں تھی ایک یہ کہ تم دولتمند ہو جاؤ اور تمہارا باپ دوزخ میں جائے۔ دوم یہ کہ تم محتاج رہو، اور تمہارا باپ جنت میں داخل ہو۔ میں نے آخری بات پسند کر لی ہے اب میں تمہیں صرف خدا ہی کے سپرد کرتا ہوں۔"

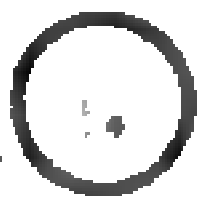
اس موقع پر ایک شخص نے کہا "حضرت کو روضۂ نبوی کے اندر جو چوتھی خالی جگہ ہے دفن کیا جائے۔" آپ نے فرمایا "خدا کی قسم! میں ہر عذاب برداشت کر لوں گا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم پاک کے برابر اپنا جسم رکھواؤں، یہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا۔"

اس کے بعد آپ نے ایک عیسائی کو بلوایا اور اس سے اپنی قبر کی زمین خریدی۔ عیسائی نے کہا "میرے لئے یہ عزت کیا کم ہے کہ آپ کی ذات پاک میری زمین میں دفن ہو۔ میں اب اس عزت کی قیمت وصول نہیں کروں گا۔" آپ نے فرمایا "یہ نہیں ہو سکتا، آپ کو قیمت لینا

ہوگی"۔ اور آپ نے اصرار کرکے قیمت اس کو اسی وقت ادا کر دی پھر فرمایا! "جب مجھے دفن کرو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ناخن اور موئے مبارک میرے کفن کے اندر رکھ دینا اسی وقت پیغام ربانی آگیا اور زبانِ مبارک پر یہ آیات قرآنی جاری ہوگئیں:۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ

ترجمہ: یہ آخرت کا گھر (بہشت) ہم نے ان لوگوں کے لئے تیار کیا ہے جو ہماری زمین میں غرور و تکبر اور فتنہ و فساد کو پسند نہیں کرتے۔ اور نتیجہ کار کامیابی و سرفرازی تو پرہیزگاروں کے لئے ہے۔"



حجاج بن یوسف

اگرچہ تاریخ اسلام میں حجاج بن یوسف کی شہرت ایک ظالم و جابر، سنگدل سفاک، اور ہلاکِ انسان کی حیثیت سے ہے تاہم اس کتاب میں اسے اس غرض سے شامل کیا گیا ہے کہ قدرت کے ابدی قانون اِنَّا مِنَ الْمُجْرِمِیْنَ مُنْتَقِمُوْنَ (ہم مجرموں سے انتقام لے کر چھوڑیں گے) کے تحت اس نوع کے تمام لوگ جس وقت دست قدرت میں خود بھی مجبور و بے بس ہو جاتے ہیں، تو کس طرح ان کی گردن کبر و نخوت ٹوٹ جاتی ہے اور انہیں اپنے جرائم کا اعتراف کرنا پڑتا ہے اور زندگی کے آخری لمحات میں ان کی گفتار و کیفیت بنی آدم کے لئے تاقیامت درس عبرت بن کر رہ جاتی ہے!

اب دیکھنا چاہئے کہ جس سنگدل اور جابر و قاہر انسان نے جنگوں کے علاوہ حالت امن میں بھی ایک لاکھ پچیس ہزار آدمی قتل کئے، بے شمار صحابہ کے ہاتھوں

پر سیسے کی نہریں لگادیں، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابیوں کو قتل کیا، وہ خود موت کے گھاٹ کیونکر اترتا۔

عراق پر بیس برس حکومت کرنے کے بعد ۵۴ برس کی عمر میں حجاج بیمار ہوا۔ اس کے معدے میں بے شمار کیڑے پیدا ہوگئے تھے، اور جسم کو ایسی سخت سردی لگ گئی تھی کہ آگ کی بہت سی انگیٹھیاں بدن سے لگا کر رکھ دی جاتی تھیں، پھر بھی سردی میں کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔

جب زندگی سے ناامیدی ہوگئی تو حجاج نے گھر والوں سے کہا مجھے بٹھادو اور لوگوں کو جمع کرو۔ لوگ آئے تو اس نے حسب عادت ایک بلیغ تقریر کی، موت اور اس کی سختیوں کا ذکر کیا، قبر اور اس کی تنہائی کا بیان کیا، دنیا اور اس کی بے ثباتی یاد کی، آخرت اور اس کی ہولناکیوں کی تشریح کی، اپنے ظلموں اور گناہوں کا اعتراف کیا، اور پھر دو تین شعر پڑھے، جن کا ترجمہ درج ذیل ہے:۔

۱۔ میرے گناہ آسمان اور زمین کے برابر بھاری ہیں، مگر مجھے اپنے خالق سے امید ہے کہ رعایت کرے گا۔

۲۔ اگر وہ اپنی رضامندی کا احسان مجھ پر کرے، تو یہی میری امید ہے، لیکن اگر وہ عدل کر کے میرے عذاب کا حکم دے۔

۳۔ تو یہ اس کی طرف سے ظلم ہرگز نہیں ہوگا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ رب ظلم کرے جس سے صرف بھلائی کی توقع کی جاتی ہے

پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ مرقعہ اس قدر حسرت انگیز تھا کہ مجلس میں کوئی بھی اپنے آنسو روک نہ سکا۔

بعد ازیں اس نے اپنا کاتب طلب کیا، اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کو حسب ذیل خط لکھوایا:۔

"اما بعد! میں تمہاری بکریاں چراتا تھا۔ ایک خیر خواہ گلہ بان کی طرح اپنے آقا کے گلے کی حفاظت کرتا تھا۔ اچانک شیر آیا، گلہ بان کو طمانچہ مارا، اور چراگاہ خراب کر ڈالی۔ آج تیرے غلام پر وہ مصیبت نازل ہوئی ہے جو ایوب صابر پر نازل ہوئی تھی مجھے امید ہے کہ وہ جبار و قہار اس طرح اپنے بندے کی خطائیں بخشنا اور گناہ دھونا چاہتا ہے۔"

پھر خط کے اختتام پر اس نے چند اشعار لکھنے کا حکم دیا جن کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

۱۔ اگر میں نے اپنے خدا کو راضی پایا تو بس میری مراد پوری ہو گئی۔

۲۔ سب مر جائیں، مگر خدا کا باقی رہنا میرے لئے کافی ہے۔ سب ہلاک ہو جائیں مگر خدا کی زندگی میرے لئے کافی ہے۔

۳۔ ہم سے پہلے یہ موت چکھ چکے ہیں۔ ہم بھی ان کے بعد موت کا مزہ چکھیں گے۔

۴۔ اگر میں مر جاؤں تو مجھے محبت سے یاد رکھنا، کیونکہ تمہاری خوشنودی کے لئے میری راہیں بے شمار تھیں۔

۵۔ یہ نہیں تو کم از کم ہر نماز کے بعد دعا میں یاد رکھنا کہ جس سے جہنم کے قیدی کو کسی قدر فائدہ پہنچ سکے

۶۔ تجھ پر ہر حال میں اللہ کی سلامتی ہو، جیتے جی، امیرے پیچھے، اور جب دوبارہ زندہ کئے جاؤ۔

اس دوران میں حضرت حسنؒ بصری اس کی عیادت کو آئے تو حجاج نے ان سے اپنی تکلیفوں کا شکوہ کیا۔ حضرت حسنؒ نے کہا "کیا میں تجھے منع نہیں کرتا تھا کہ نیکو کاروں کو نہ ستا،

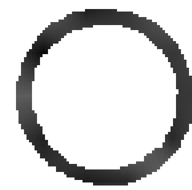
مگر افسوس تو نے میری بات نہ سنی" حجاج نے خفا ہو کر جواب دیا "میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اس مصیبت کو دور کرنے کی دعا کرو۔ بلکہ تم سے یہ دعا چاہتا ہوں کہ خدا جلد جلد میری روح قبض کرلے اور اب زیادہ عذاب نہ دے"

اسی اثنا میں ابو منذر یعلے بن مخلد مزاج پرسی کو پہنچے اور دریافت کیا: "حجاج! موت کے سکرات اور سختیوں میں تیرا کیا حال ہے؟" حجاج نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا "اے یعلی! کیا پوچھتے ہو؟ شدید مصیبت، سخت تکلیف، ناقابل بیان الم، ناقابلِ برداشت درد! سفر دراز توشہ قلیل، ــــ آہ میری ہلاکت اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کھایا!" یہ سن کر ابو منذر نے کہا "اے حجاج! خدا اپنے ان ہی بندوں پر رحم کرتا ہے، جو رحم دل اور نیک نفس ہوں، اس کی مخلوق سے محبت اور بھلائی کرتے ہوں! ــــ میں گواہی دیتا ہوں کہ تو فرعون و ہامان کا ساتھی تھا، کیونکہ تیری سیرت بگڑی ہوئی تھی۔ تو نے اپنی ملت ترک کر دی تھی، راہ حق سے کٹ گیا تھا، صالحین کے طور طریقے سے دور ہو گیا تھا۔ تو نے نیک انسان قتل کر کے ان کی جماعت فنا کر ڈالی۔ تابعین کی جڑیں کاٹ کر ان کا پاک درخت اکھاڑ پھینکا۔ افسوس! تو نے خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کی، تو نے خون کی ندیاں بہا دیں، جانیں لیں، آبروئیں برباد کیں اور کبر و جبر کی روش اختیار کی۔ تو نے نہ تو اپنا دین بچایا، اور نہ دنیا ہی پائی۔ تو نے خاندانِ مروان کو عزت دی، مگر اپنا نفس ذلیل کیا۔ ان کا گھر آباد کیا۔ مگر اپنا گھر ویران کر لیا۔ لہٰذا آج تیرے لئے نہ نجات ہے نہ فریاد، کیونکہ تو آج کے دن اور اس کے بعد سے غافل تھا۔ تو اس امت کے لئے مصیبت اور قہر تھا۔ اللہ کا بے انداز شکر ہے کہ اس نے تیری موت سے امت کو راحت بخشی اور تجھے مغلوب کر کے مسلمانوں

کی آرزو پوری کر دی۔"

راوی کہتا ہے کہ حجاج یہ سن کر مبہوت ہو گیا۔ دیر تک سناٹے میں رہا پھر اس نے ٹھنڈی سانس لی، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے، اور آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا: "الٰہی مجھے بخش دے، کیونکہ لوگ کہتے ہیں کہ تو مجھے نہیں بخشے گا۔ الٰہی! بندوں نے مجھے ناامید کر ڈالا، حالانکہ میں تجھ سے بڑی ہی امید رکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا



حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ

امام دین و سنت، مقتدائے مذہب و ملت، شیخ سنت و جماعت، حافظ ناموس قرآن، محی علم حدیث تھے۔ علوم قرآن و حدیث اور تقویٰ میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ صاحبِ فراست اور مستجاب الدعوات[1] تھے۔ تمام فرقوں نے آپ کو غایت رشد، فہم شریعت اسلامیہ، اور انصاف کے باعث متبرک سمجھا ہے، اور حق پر آپ کی اولوالعزمی اور ہمت و ثابت قدمی سب کے نزدیک یکساں طور پر مسلّم اور محترم ہے۔ آپ کے عہد میں جب فتنہ خلق قرآن[2] اٹھا یعنی قرآن کو مخلوق سمجھا جانے

---

[1] مستجاب الدعوات: وہ شخص جس کی دعا جلد قبول ہو۔ [2] یعنے معتزلہ نے یہ عقیدہ اختیار کیا کہ قرآن کو بھی مخلوقات میں شمار کرنا چاہئے اور اسے اللہ تعالیٰ ہی کا جزو یا اس کی صفت نہیں سمجھنا چاہئے۔ ان لوگوں کے برعکس حضرت امام احمد بن حنبل جیسے بعض راسخ فی العلم اور صحیح العقیدہ بزرگوں کا قطعی فیصلہ تھا کہ قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ ہی کا کلام ہے جو اس کے احکام اور نواہی پر مشتمل ہے، لہٰذا اسے خالق کائنات کی ایک عظیم الشان "صفت" تو کہا جا سکتا ہے لیکن "مخلوق" ہرگز نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ یہ عقیدہ کلام اللہ کی صریح توہین ہے۔ چنانچہ اس اختلاف و تنازعہ میں بآخر امام صاحب ہی کامیاب ہوئے اور اگرچہ اس عقیدے کی حمایت میں جان دے دی لیکن اپنی قربانی سے ایک بہت بڑے فتنے کی بیخ کنی کر دی جس کے نتائج خدا جانے کتنے دور رس اور تباہ کن ہوتے!

لگا، اور بغداد میں معتزلہ کا غلبہ ہوا، تو آپ چونکہ اس عقیدہ کے منکر و مخالف تھے؛ لہذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ امام احمد بن حنبلؒ کو اس حد تک تکلیف و اذیت دی جائے کہ وہ خلق قرآن کے قائل ہو جائیں، تاکہ اتنے بڑے عالم دین اور صاحب اثر و نفوذ شخص کو ہم عقیدہ بنا لینے کے بعد "خلق قرآن" کا عقیدہ عوام الناس میں تیزی سے مقبول و پسندیدہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ آپ کو گمراہ قرار دے کر احتساب و تعزیر کے لئے خلیفہ کے محل میں لے گئے۔ وہاں دروازے پر ایک سرہنگ دیکھا تو اس نے کہا: "اے امام! خبردار! اپنے عقیدہ و مسلک پر ثابت شجاعت سے مردانہ وار رہنا، کیونکہ میں نے ایک بار چوری کی تھی مجھے ہزار درے مارے گئے، اگر میں نے اقرار نہ کیا، آخر رہا کر دیا گیا۔ جب میں نے باطل پر اس قدر ہمت و استقلال سے کام لیا، تو تم حق پر ہوتے ہوئے اس کے زیادہ مستحق ہو۔" امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ اس کی یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں آخری سانس تک اسے فراموش نہ کر سکا پس آپ کو حاضر دربار کر کے معتزلہ نے عقیدۂ خلق قرآن کا شدت سے تقاضا کیا، لیکن آپ متواتر انکار کرتے رہے، اور اس عقیدۂ ضالہ کو خلافِ سنت، خلافِ آثارِ صحابہ، اور خلافِ شریعت اسلامیہ قرار دیا۔ اس پر ایک پیر ضعیف ہوتے ہوئے بھی آپ کو پوری قوت سے ہزار کوڑے مارے گئے کہ قرآن کو مخلوق قرآن کہو، لیکن آپ نے ایسا ہرگز نہ کہا۔ آپ کی پشت سے کھال ادھڑ چکی تھی، خون جاری تھا، اور ضعف و نقاہت سے بیہوش ہوتے جاتے تھے کہ اس اثنا میں آپ کا کمر بند کھل گیا، درآں حالیکہ آپ کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ یکایک غیب سے دو ہاتھ ظاہر ہوئے، اور انہوں نے کمر بند باندھ دیا۔ جب حاضرین نے یہ کیفیت دیکھی تو آپ کو رہا کر دیا۔ زخموں کی یہی اذیت بعد میں آپ کی وفات کا باعث ہوئی۔ آخری وقت میں لوگوں نے پوچھا

کہ "جن لوگوں نے آپ کو اس قدر تکلیف پہنچائی ہے، ان کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا "ان لوگوں نے تو مجھے باطل پر سمجھتے ہوئے حفظِ دین اور رضائے الٰہی کے لیے مارا تھا، اور یہ کوئی ذاتی رنجش نہ تھی۔ لہٰذا میں روزِ قیامت ان سے کچھ خصومت نہ کرونگا۔"

اللہ اللہ! اسلام کے عقائد حقہ پر اس قدر محیر العقول اور فقید المثال استقامت اور پھر ظالموں اور دشمنوں کے ساتھ اتنی رعایت و شفقت! — یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثہ میں پائے ہوئے "خلقِ عظیم" کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے؟

شنیدم کہ مردانِ راہِ خدا   دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

ترا کے میسر شود ایں مقام   کہ با دوستانت خلاف است جنگ

جب ان زخموں سے جن کا ذکر کیا جا چکا ہے، آپ کی وفات کا وقت قریب آیا، اور آپ زمرۂ شہداء میں داخل ہونے لگے تو اس حالت میں ہاتھ سے اشارہ کرتے تھے اور فرماتے تھے "ابھی نہیں" آپ کے صاحبزادے نے پوچھا "یہ کیا حالت ہے، اور آپ ایسا کیوں فرماتے ہیں" فرمایا "یہ بہت نازک وقت ہے، اور استفسار و جواب کا موقع نہیں۔ اب دعا سے میری مدد کرو کیونکہ شیاطین سیدھی الٹی جانب بیٹھے ہیں۔ ابلیس برابر کھڑا ہوا سر میں خاک ڈال رہا ہے، اور کہتا ہے کہ "اے احمدؒ! تم میرے ہاتھ سے ایمان سلامت لے چلے۔" میں کہتا ہوں "ابھی نہیں، کیونکہ چند سانس باقی ہیں، یہ لغزش و خطر کی جگہ ہے، نہ کہ امن اور اطمینان کی۔" اور کچھ دیر بعد آپ خلوص، تقویٰ اور بے مثل خدمتِ دین کا

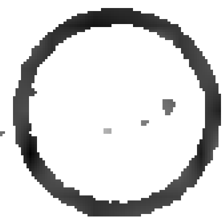
کی برکات سے اپنی متاعِ ایمان سلامت لئے ہوئے محبوب حقیقی سے واصل ہو گئے
بلاشبہ اسی مقام و رتبے کے اولیاء اللہ کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ ۝

ترجمہ "جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب واحد اللہ تعالیٰ ہے۔ ان کی طرف ملائکہ نازل کیے جاتے ہیں (جو انہیں خوشخبری دیتے ہیں) کہ تم مخلوقات میں سے کسی سے خوف نہ کھاؤ، اور نہ کسی قسم کا غم نہ کرو ہم تو تمہیں اس جنت کا مژدہ سنانے آتے ہیں، جس کا اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا ہوا ہے۔"

اسی للّٰہیت اور عشقِ حق کا ثمرہ ہے کہ جب آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو پرندے آپ کے جنازہ پر اپنے آپ کو پٹکتے تھے، یہاں تک کہ دو ہزار یہودی اور گبر و ترسا مسلمان ہو گئے۔ وہ بے اختیار زنار توڑتے اور کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا نعرہ لگاتے تھے۔ طیور کو تو رنج و اضطراب تھا ہی، لیکن مسلمانوں کے ساتھ ہی ساتھ یہودی اور عیسائی بھی یکساں طور پر گریاں و نالاں تھے۔ آپ کی وفات کے بعد ایک بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ "ان کی نظر زندگی میں زیادہ تھی یا بعدِ وفات؟" جواب دیا، حضرت احمد بن حنبلؒ کی دو دعائیں نہایت مقبول تھیں، ایک یہ کہ پروردگار! جسے تو نے ایمان نہ دیا ہو، اسے عطا فرما، اور جس دوسری کو کہ ایمان دیا ہو، اس سے واپس نہ لے۔ پس ان میں سے ایک دعا تو ان کے عینِ حیات ہی میں مقبول ہوئی کہ جس شخص کو بھی ان کے ذریعے ایمان نصیب ہوا، ان سے نہ لیا گیا، اور دوسری خود ان کی حالتِ موت میں مقبول ہوئی کہ اس قدر تکلیفوں اور اذیتوں کے باوجود آزمائش میں پورے اترے اور اپنا ایمان محفوظ و سلامت لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔" محمد بن خزیمہ فرماتے ہیں

کہ میں نے امام احمدؒ کو بعد وفات خواب میں دیکھا کہ نخرو مباحات سے چل رہے ہیں میں نے پوچھا کہ یہ کیا رفتار ہے؟ آپ نے فرمایا "اللہ تعالٰی کے بے پایاں غفران و رحمت سے جنت میں چلا جا رہا ہوں" میں نے پوچھا "اللہ تعالٰی نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟" فرمایا "خدمتِ دین اور استقامت علی الحق کے عوض میرا بے حد احترام کیا۔ مجھے معاف فرما کر تاج میرے سر پر رکھا اور نعلین پاؤں میں پہناتے ہوئے فرمایا جاؤ اے احمد! تیری یہ قدر افزائی اس لئے ہے کہ تم نے قرآن کو مخلوق نہ کہا" پھر فرمایا فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ یعنے "میرے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو، اور میری جنت میں چلا جا" [1]



---

[1] تذکرۃ اولیاء" ذکر امام احمد بن حنبلؒ۔

رحمۃ اللہ علیہ

حضرت جنید بغدادی

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ شیخ الشیوخ عالم اور امام ائمہ جہاں تھے علوم شرعی و روحانی میں کامل، اصول عبادت و تقویٰ میں ہادی مسلمین اور معاملات و ریاضات میں مثال تھے کلمات لطیف و اشارات عالی میں تمام شیوخ پر سبقت رکھتے تھے اوّل حالت سے آخر تک پسندیدہ و محبوب اور تمام فرقوں کے مقبول تھے۔ سب آپ کی امامت پر متفق تھے۔ شریعت و طریقت میں آپ کا کلام حجت ہے، اور کوئی شخص آپ کے ظاہر و باطن پر معترض نہیں ہوا۔ آپ مقتدائے اہل تصوف ہیں، اور ان کے نزدیک سید الطائفہ اور سلطان المحققین تسلیم کئے گئے ہیں عشق و زہد میں بھی بے نظیر تھے۔ اکثر مشائخ آپ کا مذہب و مسلک رکھتے ہیں، کیونکہ طریقت میں سب سے زیادہ معروف و مقبول طریقہ آپ ہی کا ہے۔ اپنے عہد میں بھی آپ تمام مشائخ کے مرجع تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں جو سب کی سب شریعت و طریقت کے

حقائق و معانی اور اسرار و نکات پر مشتمل ہیں۔ آپ ذکر و ریاضت کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔

جب آپ کی وفات کا وقت قریب آیا تو بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا دستر خوان بچھاؤ، اور میرے صاحب عشق و معرفت اور محرم راز دوستوں کو بلاؤ، تاکہ میں ان کے سامنے جان دوں۔ جب مرض الموت میں اضطراب بہت بڑھ گیا، تو فرمایا مجھے وضو کرادو، مگر لوگ وضو میں انگلیوں کا خلال کرنا بھول گئے۔ آپ نے فرمایا تو خلال کرایا گیا پھر سجدہ میں گر پڑے اور رونے لگے۔ لوگوں نے کہا، حضرت! آپ نے تو اپنی تمام زندگی میں پہلے ہی اس قدر طاعت و عبادت کی ہے۔ یہ سجدہ کا کیا وقت ہے؟ فرمایا "جنید اس وقت سے زیادہ سجدہ اور خشوع و خضوع کا کسی وقت محتاج نہ تھا۔ جب آپ نے سجدہ سے سر اٹھایا تو قرآن حکیم کی تلاوت شروع کردی۔ ایک مرید نے کہا آپ اس ضعف و اضطراب میں قرآن پڑھتے ہیں؟ فرمایا "ان آخری لمحات میں اس سے بہتر عمل میرے لئے اور کیا ہو گا۔ اس وقت میرا نامۂ اعمال طے کیا جائے گا، اور میں چاہتا ہوں کہ اس کا اختتام تلاوتِ قرآن سے ہو۔ میں اپنی ستر سالہ طاعت و عبادت کو ایک تار بال میں لٹکا ہوا پاتا ہوں، اور ہوا اسے حرکت دیتی ہے۔ نہ معلوم وہ فراق کی ہوا ہے یا وصل کی۔ ایک جانب پل صراط ہے، اور دوسری جانب ملک الموت۔ وہ احکم الحاکمین اور قاضی القضاۃ جس کی صفت عدل ہے، خلاف عدل کوئی کام نہیں کرے گا۔ راہ آخرت میرے سامنے ہے، مگر نہ معلوم مجھے کس راہ سے لے جائیں گے" پس آپ نے اسی حالت میں سورہ بقر کی ستر آیات تلاوت فرمائیں۔ جب نزع کے قریب اضطراب بہت بڑھ گیا، تو لوگوں نے کہا اللہ اللہ کہیے۔ آپ نے فرمایا میں

اپنے محبوبِ حقیقی کو بھولا نہیں ہوں، جو تم یاد دلاتے ہو۔" پھر آپ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر تسبیح و تحلیل شروع کر دی، اور اسی حالت میں آنکھیں کھول کر جان دے دی جب غسل دینے والے نے آنکھوں میں پانی پہنچانا چاہا تو ہاتف نے آواز دی کہ ہمارے دوست کی آنکھ سے ہاتھ ہٹا لے، کیونکہ جو آنکھ ہمارے ذکر میں بند ہوتی ہے اور ہمارے دیدار کے لئے ہی کھلے گی نیز غسل دینے والے نے بہت کوشش کی وہ انگشت جو آپ نے تسبیح کے لئے بند کر لی تھی، اسے کھول دے مگر نہ کھول سکا۔ اور ایک آواز سنی کہ جو ہاتھ ہمارے ذکر و اسم پر بند ہوا ہے، وہ ہمارے فرمان کے بغیر نہیں کھلے گا جب جنازہ اٹھایا گیا تو ایک سفید کبوتر آپ کے جنازے کے ایک گوشہ پر آ کے بیٹھ گیا۔ لوگوں نے بہت کوشش کی کہ اُڑ جائے، مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ یہاں تک کہ سینہ کبوتر سے یہ آواز اٹھی "مجھے اور خود کو بلاوجہ تکلیف نہ دو، کیونکہ میرا چنگل تو ان کے جنازہ میں سلا ہوا ہے۔ تم لوگ پریشان اور رنجیدہ مت ہو کہ آج تو جنیدؒ کا قالب کر بیوں (کروبیوں) فرشتوں کے نصیب میں ہے۔ اگر تمہارا شور و غوغا نہ ہوتا، تو ان کا جسم سفید باز کی مانند ہوا میں اڑ جاتا۔" آپ کو دفن کر چکنے کے بعد ایک شخص نے آپ کو خواب میں دیکھا تو دریافت کیا "آپ نے منکر و نکیر کو جواب کس طرح دیا؟" آپ نے فرمایا، جب وہ دونوں مقرب اس درگاہ ہیبت سے میرے پاس آئے اور پوچھا مَنْ رَبُّكَ ؟ (یعنی تیرا پروردگار کون ہے؟) تو میں ان کو دیکھ کر ہنسا اور کہا "میرا پروردگار وہی تو ہے جس نے روز ازل سے مجھ سے دریافت کیا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ[۱] تو میں نے کہا تھا بلیٰ[۲]

---

[۱] یعنے میں ہی تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ [۲] یعنے ہاں بے شبہ تو ہی میرا پروردگار ہے۔

اب تم مجھ سے پوچھنے آئے ہو کہ تمہارا پروردگار کون ہے۔ جس شخص نے بادشاہ کو یہ جواب دیا ہو، غلام سے کب ڈرے گا؟ آج بھی میں اسی کے الفاظ میں کہتا ہوں کہ اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ یعنی جس نے مجھے پیدا کیا، وہی صراطِ مستقیم کی جانب میری رہنمائی کرے گا۔ پس وہ آہستہ سے میرے پاس سے چلے گئے اور کہا: "یہ اہلِ عشق و محبت کے نشہ میں ہیں"۔ ایک اور شخص نے آپ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا "اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟" فرمایا: "رحمت کی اور ہمارا محاسبہ اس اعتبار و قیاس سے نہ ہوا جو ہم سمجھتے تھے۔ یہاں ہزارہا منصبِ نبوت سر نیچے ڈالے ہوئے خاموش ہیں لہٰذا ہم بھی خاموش ہو گئے کہ دیکھیں کیا حالت ہوتی ہے"۔ حریری کہتے ہیں میں نے حضرت جنید کو خواب میں دیکھا اور پوچھا "اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا؟" فرمایا اپنی رحمتِ خاصہ سے مجھے معاف فرما دیا، اور سوائے ان دو رکعتوں کے جو میں آدھی رات کو پڑھا کرتا تھا، کسی چیز سے فائدہ نہ ہوا۔ حضرت شبلیؒ آپ کے مزار مبارک کے پاس کھڑے ہوئے تھے کہ کسی نے مسئلہ پوچھا، تو آپ نے جواب نہ دیا، اور فرمایا: ـ

إِنِّي لَأَسْتَحْيِيْهِ فِي التُّرَابِ بَيْنَنَا
كَمَا كُنْتُ أَسْتَحْيِيْهِ وَهُوَ يَرَانِي

یعنی بزرگوں کی حالت حیات و ممات یکساں ہے۔ مجھے شرم آتی ہے کہ ان کے مزار مبارک کے سامنے جواب دوں، جس طرح زمانہ حیات میں ان کے سامنے شرم رکھتا تھا"۔[1]



[1] تذکرۃ الاولیاء، ذکر جنید بغدادیؒ

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت بایزید بسطامی

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اکابر مشائخ و اعظم اولیاء، خلیفہ برحق، قطبِ عالم اور مرجعِ اوتاد تھے۔ تزکیہ روح اور معرفت و بصیرت میں اپنی مثال نہ رکھتے تھے۔ آپ کی ریاضات و کرامات بہت تھیں۔ اسرار و حقائق میں نظرِ ثاقب و سعی بلیغ رکھتے تھے۔ ہمیشہ مقامِ قرب و ہیبت میں رہتے تھے، اور آتشِ عشقِ الٰہی سے مضطرب۔ شب و روز اپنے جسم کو مجاہدہ میں، اور دل کو مشاہدہ میں رکھتے تھے۔ احادیثِ عالی میں ان کی روایات مبنی بر نکاتِ حکمت ہیں۔ ان سے پہلے کسی کو معانی طریقت میں اس قدر استنباط نہ تھا۔ آپ کے روحانی کمالات برگزیدہ اولیاء اللہ کے نزدیک بھی مسلم ہیں، یہاں تک کہ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا "بایزید ہم میں ایسے ہیں جیسے ملائکہ میں جبرائیلؑ" نیز فرمایا "تمام سالکانِ توحید کی نہایتِ میدان بایزید کی ابتداء ہے۔"

روایت ہے کہ آپ زندگی میں "یا اللہ یا اللہ" کا ورد بہت فرمایا کرتے تھے۔ اور

پھر نزع کے وقت بھی یا اللہ یا اللہ کا ورد ہی آپ کی زبان سے سنا گیا۔ مرض الموت میں آپ نے محویت و استغراق کی حالت میں فرمایا "یا رب! میں نے تجھے کبھی غفلت میں (یعنے حضورِ قلب کے بغیر) یاد نہیں کیا، اور اب کہ روح پرواز کرنے والی ہے تیری طاعت و عبادت سے غافل ہوں نہ معلوم اب حضور کب نصیب ہو تیرے دربار میں حاضر ہونے پر جب تو مجھ سے پوچھے گا کہ بایزید تم میرے لئے دنیا سے کیا تحفہ لائے ہو تو میرا جواب ہو گا کہ "پروردگار! میں تیرے شایانِ شان تو کوئی تحفہ نہیں لایا ہاں میں نے تیرے ساتھ دنیا میں کسی کو شریک نہیں کیا تھا" اور اسی ذکر و حضور میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

سبحان اللہ اس مقام پر ہر مسلمان کو غور کرنا چاہئیے کہ دربارِ الٰہی میں تحفۂ توحید سے بڑا تحفہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ تمام کتب سماوی اور بعثتِ انبیاء کا سب سے پہلا اور حقیقی مقصد ہی نوعِ انسانی کو توحید باری تعالیٰ کی عظمت و اہمیت اور روحانی و اخلاقی افادیت سمجھانا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تمام ان ذرائع شرک کو بھی نیست و نابود کرنا تھا، جو اوہام انسانی نے کسی دلیل و برہان کے بغیر پیدا کر رکھے تھے اور کیا شرک کی تردید و مذمت میں اللہ تعالیٰ کا یہ واضح اعلان کافی نہیں کہ :-

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ

یعنی "اللہ تعالیٰ یہ گناہ تو ہرگز معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے ہاں اس کے علاوہ دیگر گناہوں میں سے جسے چاہے گا معاف فرما دے گا"

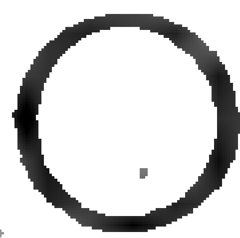
اور اسی بنا پر حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو سب سے اہم اور مقدم نصیحت یہی کی تھی کہ :-

یَا بُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ ۔ یعنے " اے بیٹا! اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخلوقات میں سے کسی کو ہرگز شریک مت کرنا، کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے"۔

اس تذکرہ کا مقصد یہ ہے کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے آخری قول کی غایت اور روحِ تعلیم ہر مسلمان پر روشن و واضح ہو جائے۔ جس شب کو آپ کی وفات ہوئی ابو موسیٰ موجود نہ تھے۔ کہتے ہیں میں نے اسی رات خواب میں دیکھا کہ عرش کو اپنے سر پر رکھے ہوئے ہوں۔ مجھے تعجب ہوا، اور علی الصبح یہ خواب حضرتِ جنیدؒ کو سنانے چلا تو آپ وفات پا چکے تھے۔ نمازِ جنازہ کے لئے بہت سے لوگ اطراف سے آئے ہوئے تھے جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو میں نے کوشش کی کہ جنازے کا ایک کونہ مجھے دے دیں، مگر نہ ملا میں نہایت بے صبر ہوا اور جنازے کے نیچے جا کر اس کو سر پر اٹھا لیا، درآں حالیکہ میں خواب بھول چکا تھا۔ میں نے اسی حالت میں حضرت کو دیکھا فرماتے تھے اے ابو موسیٰ! یہ تیرے رات والے خواب کی تعبیر ہے جو عرش تو نے سر پر اٹھایا تھا، وہ بایزید کا جنازہ ہے"!

جب آپ کو دفن کیا گیا تو حضرت خضرویہ کی زوجہ جو خود صاحبِ کشف و حال تھیں، مزار مبارک کی زیارت کو گئیں۔ جب وہ زیارت سے فارغ ہو چکیں، تو حاضرین سے کہا "کیا تم جانتے ہو کہ حضرت بایزیدؒ باطنی طور پر کیسا بلند رتبہ رکھتے تھے؟ — میں تمہیں بتاتی ہوں کہ ایک رات میں خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی کہ ایک ساعت بیٹھ گئی اور مجھ پر نیند نے غلبہ کیا۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ملائکہ مجھے آسمان پر لے گئے اور عرش کے نیچے پہنچا دیا۔ وہاں میں نے ایک وسیع بیابان دیکھا جس کا طول و عرض ناپید تھا، اور ہر طرف پھول کھل رہے تھے۔ وہاں ہر پتے اور پھول پر لکھا تھا کہ بایزیدؒ ولی اللہ تھے"! ایک بزرگ کہتے ہیں میں نے آپ کو خواب میں دیکھا تو کہا مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے ایک شعر

عرق میں پڑی ہے کہ تحت ہیں کہ مرتسال عدیل ایک بے بضاعتی میں معتدل ہے
یہ یکشتی ہے اس کو کوشش کر کے اس کشتی میں موجود کرو تاکہ تم سکون کرو اس
تم آتش سے سوختہ کے ساتھ پار کرے۔ بعض بزرگوں نے آپ کو خواب میں
دیکھ کر دریافت کیا کہ تصوف کیا ہے؟ فرمایا غفلت و آسائش کو ترک کرنا اور
ذکر و عبادت اور محنت و ریاضت میں معروف رہنا۔ جب شیخ ابو سعید ابو الخیر
آپ کے مزار مبارک کی زیارت کو گئے تو ایک ساعت تک کھڑے رہے اور جب
لوٹے تو فرمایا یہ ایسی جگہ ہے کہ دنیا میں جس کی کوئی چیز گم ہو گئی ہو وہ یہاں تلاش کرے



لے یعنی جس شخص کے روحانی فیوض و برکات زائل ہو چکے ہوں وہ یہاں سے اکتساب فیض کرے۔
ے متذکرۃ الاولیاء ذکر بایزید بسطامی رح

تحریر کی گئی تبارک اللہ نے

حضرت امام محمد بن محمد غزالی

امام صاحب نے ۱۴ر جمادی الثانی ۵۰۵ھ ہجری میں بمقام طہران انتقال فرمایا، اور وہیں مدفون ہوئے۔ ابن جوزی نے ان کی وفات کا قصہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے حسب ذیل لکھا ہے:-

"پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے وضو کرکے نماز پڑھی پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگاکر کہا "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے۔ لوگوں نے دیکھا تو دم نہ تھا۔[1]

امام صاحب کے مرنے کا تمام اسلامی دنیا کو صدمہ ہوا۔ اکثر شعراء نے مرثیے بھی لکھے چند شعر یہ ہیں

---

[1] شرح احیاء العلوم بحوالہ ابن جوزی صفحہ ۱۱

بکی علی حجۃ الاسلام حین ثوی ‏ ‏ من کل حیی عظیم القدر اشرفہ

تلک المرزیۃ تستوہی قوی جلدی ‏ ‏ والطرف تسھرہ والدمع تنزفہ

مضی وأعظم مفقود فجعت بہ ‏ ‏ من لا نظیر لہ فی الناس یخلفہ [1]

حضرت امام غزالی کی موت گویا اُس عہد میں تحقیق و اجتہاد، تجدید دین، احیائے روحِ اسلامی، احق اندیشی و حق گوئی، اور اسرارِ معرفت و تصوف کی موت تھی۔ امام صاحب نے مسائل شریعت اور نکاتِ تصوف و اخلاق میں جو گوہر افشانی فرمائی ہے اور جیسے جیسے حقائق و معارف مسلمانوں پر واضح کیے ہیں، ان کی مثال آپ سے ماقبل اور مابعد کہیں سے نہیں ملتی۔ یوں تو آپ نے فقہ، اصولِ فقہ، منطق، فلسفہ، علم کلام، اور تصوف و اخلاق پر کثیر التعداد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، لیکن افادۂ عام کے لحاظ سے "احیاء العلوم" اور "کیمیائے سعادت" سیرت و اخلاق کی اصلاح میں بہت بلند رتبہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح اسرارِ معرفت اور تصوف میں "منہاج العابدین" اور "معراج السالکین" ایک امتیازی شان کی حامل ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں پر امام صاحب کے بے شمار علمی احسانات ہیں، جن کا تعلق زیادہ تر تزکیۂ باطن، تطہیرِ قلب و ذہن اور اصلاحِ عقائد سے ہے۔ ان کے قلم حقیقت رقم سے پھوٹے ہوئے چشمے تا ابد جاری رہتے ہوئے تشنگانِ علم و معرفت کو سیراب کرتے رہیں گے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

---

[1] "الغزالی" از شبلی نعمانی، ص ۲۶

رحمۃ اللہ تعالیٰ

حضرت ابوبکر شبلی

حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ تصوف و طریقت میں وحید عصر اور حال و علم میں بے ہمتا تھے۔ آپ رموز و نکات شریعت پر حاوی تھے اور اپنے زمانہ کے مشائخ کو دیکھا تھا، اور ان کی صحبت سے فیضیاب ہوتے تھے۔ علوم طریقت میں یگانہ روزگار تھے، اور آپ کی ریاضات و کرامات مشہور ہیں۔ شریعت و تصوف میں اول سے آخر تک کامل و پختہ کار تھے، اور آپ کے احوال میں کبھی ضعف و فتور نہ آیا، اور آتش عشق و محبت کی شدت کسی چیز سے کم نہ ہوئی۔ آپ منصور حلاج کے قریبی دوست اور محرم راز تھے۔ حضرت جنیدؒ آپ کے رشتہ دار تھے، جن سے بعد میں شریعت و تصوف اور طریقت کے رموز و نکات سیکھے، اور روحانی و باطنی طور پر اکتساب فیوض و برکات کیا۔ خصوصاً حدیث و فقہ میں ایسا تبحر علمی رکھتے تھے کہ ان کے ہم عصر استاد بھی انہیں اپنا پیشوا مانتے تھے۔

جب آپ کی وفات قریب ہوئی تو دونوں آنکھوں میں تیرگی چھا گئی، اور اکثر منگا کر سر پر ڈالنے لگے یہ حضورِ حق تعالیٰ اپنے عجز و ندامت کا ایک مظہر ہے، جب آپ کا اضطراب انتہا کو پہنچ گیا تو لوگوں نے بے چینی کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا "رسول اکرم رحمۃ للعالمین تھے، امام الانبیا تھے، اور حضور کی مغفرت قطعی طور پر موجود تھی لیکن باایں ہمہ دن کے علاوہ تمام رات مصروفِ عبادت رہتے تھے اور آنکھیں خوفِ حق تعالیٰ سے گریاں رہتیں۔ فرماتے کہ قرآن کی آیاتِ عذاب نے میری کمر توڑ دی ہے اور مجھے بوڑھا کر دیا ہے پس میں اسی اضطراب مسلسل میں ہوں کہ جب ایسے جلیل الشان کا یہ حال ہے تو اس کے ایک غافل و گنہگار امتی کا کیا حشر ہوگا۔" پھر فرمایا "قرآن میں اگرچہ شیطان کو "ملعون" قرار دیا گیا ہے، لیکن میرے لئے وہ بھی قابلِ رشک ہے اور چاہتا ہوں کہ محبوب حقیقی کے ساتھ ایسا ربط و تعلق مجھے حاصل ہو کیونکہ اگرچہ وہ ملعون ہے لیکن اس کی اضافت و نسبت تو دوست کی طرف ہے۔" پھر آپ تھوڑی دیر خاموش رہ کر دوبارہ مضطرب ہو گئے، اور فرمایا "اس کی جانب سے دو قسم کی ہوائیں چلتی ہیں۔ ایک لطف کی اور دوسری قہر کی پس جس جانب لطف کی ہوا چلتی ہے، وہ اس کو مطلوب و مقصود تک پہنچا دیتی ہے اور جس پر قہر و غضب کی ہوا چلتی ہے وہ حجاب و غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر مجھ تک لطفِ پروردگار کی ہوا آجائے گی تو میں اس کی امید رحمت پر نزع کی تمام سختی جھیل سکتا ہوں، اور اگر عیاذاً باللہ باد قہر آئے گی، تو روحانی و باطنی طور پر جو دردناک کیفیت میری ہوگی، اس کے مقابل نزع کی اذیت و پریشانی کچھ بھی نہیں۔ پھر وفات کے وقت فرمایا مجھے طہارت اور وضو کراؤ۔ جب وضو کرایا گیا تو داڑھی کا خلال بھول گئے مگر آپ نے یاد دلا دیا۔ جس رات آپ کی وفات ہوئی آپ رات بھر

شعر پڑھتے رہے جو سوزِ عشق و محبت اور امید رحمت سے لبریز ہے:-

كُلُّ بَيْتٍ أَنْتَ سَاكِنُهُ غَيْرُ مُحْتَاجٍ إِلَى السُّرُجِ
وَجْهُكَ الْمَأْمُوْلُ حُجَّتُنَا يَوْمَ يَأْتِي النَّاسُ

یعنی جس گھر میں تو ساکن ہو اس کو چراغ کی حاجت نہیں۔ جس دن لوگ اپنی اپنی حجت و دلیل لائیں گے، اس وقت تیرا روئے پُر نور، جو ہمارا مرجع امید ہے، نجات و غفران کے لئے ہماری حجت و دلیل ہوگا۔"

اس کیفیت کا حال لوگوں نے سنا، تو بہت سے عقیدت مند نماز پڑھنے کے لئے حاضر ہوئے، حالانکہ ابھی آپ کی وفات نہیں ہوئی تھی۔ آپ فراست سے ان کی آمد کا مقصد سمجھ گئے، اور فرمایا: "یہ عجیب حالت ہے کہ مردہ لوگ ایک زندہ شخص کی نماز پڑھنے آئے ہیں۔[1]" لوگوں نے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہئے۔" فرمایا "جب غیر اللہ ہے ہی نہیں، تو میں نفی کس کی کروں[2]؟" حاضرین نے کہا "اس وقت کلمہ پڑھے بغیر چارہ نہیں"۔ آپ نے فرمایا "سلطانِ محبت تو یہ فرماتا ہے کہ میں کسی قسم کی رشوت قبول نہیں کرونگا۔ پھر ایک شخص نے باآوازِ بلند کلمۂ شہادت کی تلقین کی تو فرمایا: "ایک مردہ شخص زندہ کو تلقین نصیحت کرنے آیا ہے۔" ذرا دیر کے بعد لوگوں نے پوچھا کہ آپ کی حالت کیسی ہے۔ فرمایا: "میں اپنے

---

[1] آیاتِ قرآنی کی رو سے اولیاء اللہ مر کر بھی زندہ ہیں، اور انہیں مردہ ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن جو لوگ حیاتِ قلبی اور مجاہدہ و مشاہدہ سے محروم ہوں، وہ زندہ رہ کر بھی مردہ ہیں۔ [2] یہ ذاتِ الٰہی میں محویت و استغراق اور توحید پرستی کی انتہا ہے کہ کائنات میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور کسی شے کا وجود ہی محسوس و مرئی نہ ہو۔

محبوبِ حقیقی تک پہنچ چکا ہوں۔" یہ کہتے ہی آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی بعد کو دوست نے آپ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا "منکر نکیر کے وقت آپ نے کیا کیا"؛ فرمایا "انہوں نے آکر پوچھا مَنْ رَبُّكَ (تیرا پروردگار کون ہے) میں نے کہا میرا پروردگار وہی ہے جس نے تمہیں اور دیگر تمام فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ میرے دادا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو، اور میں پشتِ آدم ہی میں تمہارا نظارہ کرتا تھا" وہ بولے "تو نے تو گویا تمام آدمیوں کی طرف سے جواب دے دیا" پھر وہ چلے گئے ایک اور شخص نے آپ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا "حق تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا" فرمایا "اس نے میرے کسی عمل پر اتنا سخت محاسبہ نہیں کیا، جتنا ایک قول پر، ایک روز میری زبان سے نکل گیا تھا کہ اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں کہ بہشت سے محروم رہو اور دوزخ میں جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بات پر عتاب کیا، اور فرمایا اس سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں کہ لوگ میرے دیدار سے محروم رہیں اور مجھ سے دور و محجوب ہوں" ایک اور شخص نے آپ کو خواب میں دیکھا تو پوچھا كَيْفَ وَجَدْتَ سُوْقَ الْآخِرَةِ یعنے آپ نے بازارِ آخرت کو کیسا پایا؟ فرمایا "میں نے ایسا پایا کہ اس بازار میں سوختہ جگروں اور شکستہ دلوں ہی کی رونق ہے، اور دوسروں کی پرستش نہیں یہاں جلے ہوئے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں، اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتے ہیں، اور علاوہ ازیں کسی چیز کی طرف التفات نہیں کرتے۔"



لہ تذکرۃ الاولیاء ذکر ابو بکر شبلی

رحمۃ اللہ تعالیٰ
حضرت حسین منصور حلاج

حضرت منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کے روحانی و باطنی حالات عجیب و غریب گذرے ہیں۔ ایسا طریقہ رکھتے تھے جو ان ہی کے ساتھ مخصوص تھا کہ غایت سوز و اشتیاق اور شدت فراق میں مست و بے قرار تھے۔ ریاضت و عبادت میں جد و جہد عظیم اکرامات عالی قدر، اور کلام زیبا رکھتے تھے۔ شریعت اسلامیہ کے معانی و معارف اور حقائق و اسرار میں نہایت کامل تھے۔ آپ کی مثال نظر دقیق اور فراست و کیاست اور کسی کو حاصل نہ تھی۔ اول سے آخر تک ان کے احوال عشق کی اساس آفات اور مصائب و نوائب پر ہے، کیونکہ انہوں نے علانیہ "انا الحق" کہہ دیا تھا، اور ان کے اپنے بیان کے مطابق اس بنا پر کہا تھا کہ کائنات کی تمام مخلوقات درحقیقت ذاتِ حق تعالیٰ کے مظاہر ہیں جن میں اس نے اپنی جلوہ نمائی کی ہے۔ اس عقیدہ کی بنیاد اس آیہ شریفہ پر تھی، اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْہُ اللّٰہِ یعنے "تم جب طرف بھی اپنا منہ پھیرو، اسی طرف اللہ تعالیٰ کے

چہرہ جمیل کو موجود پاؤ گے" علاوہ ازیں وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۔ (سورۃ ق) یعنی ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے، اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے نفس میں کیا کیا خیالات و احساسات گذرتے رہتے ہیں، اور ہم انسان کی جانب اس کی شاہ رگ سے بھی قریب تر ہیں
بنابرایں منصور حلاج فرماتے ہیں کہ جب انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے انائیت حق ہے، اور اسی کی ذات و صفات کا مظہر اعلیٰ ہے تو میرے "انا الحق" کہہ دینے میں تعجب و تعزیر کی کونسی بات ہے!

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ عوام الناس کا فہم و شعور اور مشاہدہ و نظر باطل سطحی ہیں، اور وہ اسرار عشق کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ جب خلق خدا آپ کی حالت سے متحیر ہوئی، تو زبانیں آپ کے خلاف دراز ہوئیں، اور آپ کو کافر و زندیق سمجھا جانے لگا۔ علمائے وقت کو بھی آپ کے خلاف برانگیختہ کیا گیا، اور خلیفۂ عہد کے کان بھی بھرے آخر لوگوں نے آپ کے قتل پر اتفاق کیا، اور حیلہ یہ کیا کہ منصور "انا الحق" کہتے ہیں۔ آپ سے تقاضا کیا گیا کہ "ہوالحق" کہو۔ آپ نے جواب دیا "سب میں وہی ہے اگر تم کہتے ہو کہ وہ گم ہو گیا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ وہ تو ابدی طور پر موجود ہے، لیکن حسین منصور گم ہو گیا ہے۔ بحر محیط کبھی گم اور کم نہیں ہوتا" الغرض علمائے ظاہر کی ایک جماعت آپ کے درپے ہو گئی اور خلیفہ مستعصم کے سامنے آپ کے عقائد و خیالات کو بہت بری صورت میں پیش کیا۔ علی بن عیسیٰ وزیر آپ سے خفا ہو گیا اور ایک سال تک آپ کو قید خانہ میں رکھا۔ مگر لوگ پھر بھی متواتر آپ کے پاس جا کر مسائل پوچھتے تھے۔ پھر لوگوں کو آپ کے پاس جانے سے منع کر دیا گیا۔ پانچ مہینے تک کوئی آپ کے پاس نہ گیا، مگر ایک بار ابن عطا

ایک بار عبداللہ حنیفؒ ملاقات کو گئے۔ ابن عطاؒ نے آپ کے پاس آدمی بھیجا کہ "اے شیخ جو بات آپ نے کہی ہے، اس کا عذر کیجئے، تاکہ قید خانہ سے رہائی ہو جائے" آپ نے کہلا بھیجا "جس نے "انا الحق" کہا ہے اس سے کہو کہ عذر کرے"۔ ابن عطاؒ یہ سن کر رو پڑے، اور فرمایا کہ "ہم خود ہی حسین منصور ہیں"۔ بعض صاحب بصیرت علماء کہتے ہیں کہ "جب یہ جائز ہے کہ ایک درخت سے "انی انا اللہ" (اے موسیٰؑ! بلاشبہ میں ہی اللہ ہوں) کی آواز سنائی دے، اور درخت درمیان میں نہ ہو، تو یہ کیوں جائز و ممکن نہیں کہ حسین منصور کی زبان سے "انا الحق" نکلے، اور وہ خود درمیان میں نہ ہوں۔ جس طرح "اَلحَقُّ یَنطِقُ عَلیٰ لِسَانِ عُمَرؓ" کے پیش نظر حق تعالیٰ نے حضرت عمرؓ کی زبان سے کلام کیا، اس طرح حسین منصورؒ کی زبان سے کیا"۔

بہر کیف چونکہ علماء کی ایک جماعت آپ کے خلاف کفر کا فتویٰ دے چکی تھی، اور خلیفۂ عہد اور وزیر کا بھی آپ پر عتاب تھا، لہٰذا آپ کی تعزیر جاری رہی۔ روایت ہے کہ جب آپ کو قید کیا گیا، تو لوگوں نے پہلی رات آکر دیکھا، تو تلاش و جستجو کے باوجود آپ کو قید خانہ میں کہیں نہ پایا۔ دوسری رات کو آکر دیکھا تو قید خانہ ہی موجود نہ تھا، لیکن تیسری رات کو آئے تو آپ کو قید خانہ میں موجود پایا۔[1] پوچھا "اول شب آپ کہاں تھے، دوسری شب نہ آپ تھے

---

[1] اولیاء اللہ سے بعض حالات میں اس قسم کی جو خارق العادت کرامات ظاہر ہوتی ہیں، ضروری نہیں کہ عام انسانوں کی عقل و مشاہدہ پر پوری اتریں۔ قرآن کریم میں انبیاء کے کتنے ہی معجزات مذکور ہیں، جن پر ایمان رکھنا ہر مسلمان کے لئے واجب ہے، تو اولیاء اللہ کی ایسی کرامات میں شبہ کیوں کیا جائے؟—

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں — عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ!

اور نہ قید خانہ۔ اور اب دونوں موجود ہو گئے۔" فرمایا "ہاں میں پہلی شب حاضر درگاہِ الٰہی تھا دوسری شب یہیں اس کا دربار لگ رہا تھا، لہٰذا قید خانہ ظاہر نہ ہوا۔ اب مجھے واپس کر دیا گیا ہے۔ تم لوگ حفظِ شریعت کے لئے آؤ اور اپنا کام کرو۔" شبانہ روز میں ہزار رکعتیں قید خانہ میں پڑھا کرتے تھے۔ لوگوں نے کہا آپ تو کہتے ہیں میں حق ہوں پھر یہ نماز کس لئے پڑھتے ہیں؟" فرمایا "جب سینے میں حق ہی حق بستا ہے تو ہم ہی اپنی صحیح قدر و منزلت سمجھتے ہیں۔[ا]" ایک شب قید خانہ میں تین سو اشخاص قید تھے۔ فرمایا "اے قیدیو! میں تم کو آزاد کر دوں" انہوں نے کہا "آپ کیسے آزاد کریں گے۔ اگر کر سکتے ہو تو پہلے اپنے آپ کو تو آزاد کر لو۔" فرمایا "ہم خدا کی قید میں ہیں، اور اسرار شریعت کا پاس کرتے ہیں۔ اگر چاہیں تو ایک اشارہ میں تمام بیڑیاں توڑ ڈالیں؟" پھر آپ نے انگشت سے اشارہ کیا تو تمام بیڑیاں ٹوٹ گئیں۔ انہوں نے کہا "اب نکلیں کہاں سے؟ قید خانہ کا دروازہ تو بند ہے۔" پھر آپ نے دوسرا اشارہ کیا تو دیوار زنداں میں کھڑکیاں ظاہر ہو گئیں۔ فرمایا "اپنا کام کرو۔" انہوں نے کہا "آپ نہیں آئیں گے کیا؟" فرمایا "ہمارا ذات حق تعالیٰ کے ساتھ ایک سر ہے اور سر داری کہہ سکتے ہیں۔" دوسرے روز پوچھا گیا کہ "قیدی کہاں ہیں؟" فرمایا "ہم نے انہیں رہا کر دیا" انہوں نے کہا "آپ یہاں کیوں رہ گئے؟" فرمایا "ہمیں خدا کی جانب سے چلے جانے کا حکم نہیں ہوا۔ کہ اس فعل کو خوفِ خلق پر محمول نہ کیا جائے۔" جب یہ واقعات و سانحات بادشاہ تک پہنچے تو اس نے کہا "یہ ملک میں فتنے برپا کریں گے، لہٰذا انہیں ہلاک کر ڈالو۔ لیکن موت سے پہلے شدید درّے لگاؤ، تاکہ وہ اس قول انا الحق سے باز آ جائیں۔" چنانچہ

[ا] اسی مفہوم میں نظیری کا ایک شعر ہے۔

آں راز کہ در سینہ نہان است نہ وعظ است
بر دار تواں گفت، بہ منبر نتواں گفت

رنے والا کہتا ہے کہ میں جب بھی درہ مارتا تھا، اس کے ساتھ ایک فصیح آواز سنتا تھا "یا ابن منصور لا تخف"، یعنے "اے ابن منصور خوف نہ کر" پھر آپ کو لے جا کر دار پر لٹکا یا گیا، تو بہزاروں لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ اور آپ آنکھ اٹھا کر جدھر بھی دیکھتے تھے، فرماتے تھے "حق، حق، انا الحق" ایک درویش نے جا کر پوچھا "عشق کیا ہے؟" فرمایا "عشق کا مفہوم وا ثر آج، کل اور پرسوں اپنی آنکھ سے دیکھ لوگے۔" اس روز آپ کو شہید کیا گیا، دوسرے روز جلا یا گیا۔ اور تیسرے روز خاک ہوا میں اڑائی گئی یعنے عشق کے تاثرات اور نتائج و عواقب یہ ہیں۔ خادم نے اس وقت وصیت چاہی تو فرمایا "نفس کو کسی دلچسپ مگر جائز و مباح چیز میں مشغول رکھ، ورنہ وہ باغی ہو کر تجھے کسی ایسی چیز میں مشغول کر دے گا جو حرام و تباہ کن ہوگی، لیکن تجھے وہ کرنا پڑے گی، کیونکہ نفس پر ضبط و اختیار رکھنا نہایت کامل اور قوی لوگوں کا کام ہے۔" صاحبزادہ نے کہا "مجھے کچھ وصیت فرمایئے۔" فرمایا "جب دنیا والے اپنی اپنی جگہ نیک اعمال میں کوشش کریں، تو تم ایک ایسی چیز کی تحصیل میں کوشش کرنا جس کا ایک ذرہ جن و انس کے تمام اعمال صالحہ سے بہتر ہے، اور وہ ہے علم حقیقت" جب لوگ آپ کو سردار کے جا رہے تھے، تو آپ خوب اکڑتے اور ہاتھ جھاڑتے چلے جاتے تھے، انہوں نے پوچھا "آپ اکڑتے کیوں ہیں؟" فرمایا "اس لئے کہ منزل جاناں کو چلا جا رہا ہوں۔" اور نعرہ لگا کر فرماتے تھے:-

نَدِیْمِیْ غَیْرُ مَنْسُوْبٍ اِلٰی شَیْءٍ مِّنَ الْحَیْفِ

سَقَانِیْ مِثْلَ مَا یَشْرَبُ کَفِعْلِ الضَّیْفِ بِالضَّیْفِ

فَلَمَّا دَارَتِ الْکَاْسُ دَعَا بِالنَّطْعِ وَالسَّیْفِ

کَذَا مَنْ یَشْرَبُ الرَّاحَ مَعَ التِّنِّیْنِ بِالصَّیْفِ

یعنے " میرا دوست اور ہم نشین فضولیت اور جفا کی طرف منسوب نہیں ہے۔ اس نے مجھے شراب عشق پلائی، جس طرح مہمان مہمان کو پلاتا ہے۔ جب چند دور ہو چکے، تو اس نے شمشیر منگائی، (اور بولا) " جو شخص گرمیوں میں پرانی شراب اژدہے کے ساتھ پیئے، اس کی یہی سزا ہے "

جب باب الطاق میں آپ کو دار کے نیچے لے گئے، تو آپ نے دار پر بوسہ دیا اور پھر سیڑھی پر قدم رکھا۔ لوگوں نے پوچھا " یہ کیا حالت ہے؟ " آپ نے فرمایا " عاشقانِ زندہ دل اور مردانِ حق کی انتہائی مسرت و سعادت سر دار ہے " پھر آپ نے کمر باندھی اور چادر ڈال کر ہاتھ اٹھائے، اور قبلہ مناجات کی طرف منہ کر کے فرمایا " پروردگار! جو چاہا تھا پالیا " جب دار پر چڑھائے گئے تو جو لوگ آپ کے مرید تھے انہوں نے سوال کیا کہ آپ ہمارے حق میں کیا فرماتے ہیں کہ آپ کے عقیدتمند اور معتقد ہیں اور ان منکروں کے حق میں کیا فرماتے ہیں جو آپ کے پتھر ماریں گے اور سولی چڑھائیں گے؟ فرمایا " ان کو دو ثواب ہیں اور تم کو ایک ثواب، کیونکہ تم کو میرے ساتھ حسن ظن ہی ہے اور ناموس شریعت اور حفظِ توحید کے لئے مجھ سے تشدد کرتے ہیں، اور شرع میں توحید اصل ہے، اور حسن ظن فرع ہے " پھر شبلیؒ آپ کے برابر آئے اور بلند آواز سے فرمایا کیا آپ دونوں جہانوں سے بے نیاز نہیں ہو گئے؟ فرمایا عشق حقیقی کا یہ سب سے بڑا مفاد ہے! پھر حضرت شبلیؒ نے پوچھا " تصوف کی حقیقت کیا ہے؟ " فرمایا " تصوف کا ادنیٰ درجہ یہ ہے جو تم دیکھتے ہو " پوچھا " اعلیٰ درجہ کیا ہے؟ " فرمایا " تمہیں وہاں تک راہ نہیں۔ پوچھ کر کیا کرو گے " پھر ہر شخص نے آپ کے پتھر مارے، اور شبلی نے موافقت کے لئے ایک پھول مار دیا، تو آپ نے آہ کی۔ لوگوں نے پوچھا " تمام حاضرین

لیے پتھر مارے تو آپ نے آہ نہ کی اور اس پھول پہ آپ آہ کرتے ہیں؟" فرمایا "وہ لوگ میرے عشق کی حقیقت کو نہیں جانتے، لہذا معذور ہیں، لیکن مجھے ان کا پھول بھی گراں ہے، کیونکہ یہ جانتے ہیں کہ ایک فنا فی اللہ شخص کو مارنا نہ چاہیے۔" پھر دار کی سیڑھی پر آپ کے ہاتھ علیحدہ کر دیئے گئے تو ہنسے۔ لوگوں نے پوچھا آپ کو ہنسی کس بات پر آئی؟ فرمایا "انسان کے ان مادی ہاتھوں کو جدا کرنا آسان ہے۔ ایسے مرد چاہئیں جو ہمارے دستِ صفات کو جو سرِ عرش سے بلند ہے، قطع کر کے دکھائیں۔" پھر آپ کے پاؤں کاٹے گئے تو بھی مسکراتے ہوئے فرمایا "اگر میں نے زمین کا سفر ان پاؤں سے کیا ہے، تو میرے اور بھی باطنی قدم ہیں جن سے ہر دو عالم کا سفر کروں گا۔ ان کو کاٹ سکتے ہو تو کاٹو۔" پھر دونوں ہاتھ، جو خون آلود تھے، منہ پر مل لئے۔ لوگوں نے پوچھا "ایسا کیوں کرتے ہیں؟" فرمایا "میرا خون کافی مقدار میں بہ چکا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چہرہ زرد ہو گیا ہوگا، جس سے تم لوگ یہ قیاس کرو گے کہ یہ زردی خوف کی وجہ سے ہے لہذا میں چہرہ پر خون ملتا ہوں تاکہ لوگوں کو سرخ رو دکھائی دوں، اور وہ میرے متعلق گمان باطل نہ کریں۔" لوگوں نے پوچھا "اگر منہ خون سے سرخ کرتے ہو تو کہنیوں تک بازو خون آلود کرنے کے کیا معنی؟" فرمایا "وضو کرتا ہوں۔" پوچھا "کیسا وضو؟" جواب دیا رَکْعَتَانِ فِی الْعِشْقِ لَا یَصِحُّ وُضُوْءُھُمَا اِلَّا بِالدَّمِ یعنی "نمازِ عشق میں دو رکعتیں ایسی ہیں جن کا وضو خون کے بغیر جائز نہیں ہو سکتا۔" اور اس دوران میں آپ کے خون کا جو قطرہ بھی زمین پر گرتا تھا، انا الحق کا نقش بن جاتا تھا۔ پھر آپ کی آنکھیں نکالی گئیں تو حاضرین میں بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ بعض روتے تھے بعض پتھر پھینکتے تھے پھر چاہا کہ زبان کاٹ لیں، تو فرمایا اتنا صبر کرو کہ میں ایک بات کہہ لوں۔ اور آسمان

کی طرف منہ کر کے کہا "الٰہی! یہ لوگ تیرے دین کے حفظ و ناموس کی خاطر مجھے اس قدر تکلیف دیتے ہیں، انہیں محروم نہ رکھ، اور میرے سبب انہیں اپنی رحمت سے بے نصیب نہ کر۔ الحمد للہ کہ اگر میرے ہاتھ پاؤں کاٹے تو تیری راہ میں، اور دار پر چڑھاتے ہیں تو تیرے مشاہدہ جلال میں۔ میں زندگی کے آخری لمحات میں اپنی مراد کو پہنچ گیا۔" پھر آپ کے ناک اور کان کاٹے گئے اور لوگوں نے پتھر برسانا شروع کئے۔ ایک بڑھیا ہاتھ میں پیالہ لئے ہوئے جب منصور کو دیکھا تو کہا "زور سے پتھر مارو اس ظالم کو۔ عشق سے کیا کام" آپ کا آخری کلام یہ تھا کہ حُبُّ الوَاحِدِ اِفرادُ الوَاحِدِ، حُبُّ الوَاحِدِ اِفرادُ الوَاحِدِ "یعنے" "اس ہستی واحد کی محبت یوں نمایاں ہوئی کہ وہ فرد واحد اللہ تعالیٰ افراد مخلوق میں ظہور پذیر ہو گیا۔"[1] پھر آپ نے یہ آیت شریفہ پڑھی:

یَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهَا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا وَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ[2] ترجمہ: "جن لوگوں کو قیامت کا یقین نہیں، وہ اس کی آمد کے لئے جلدی مچاتے رہتے ہیں، اور جو لوگ ایماندار ہیں، وہ قیامت سے ڈرتے رہتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اس کا آنا برحق ہے۔"

نماز شام کے وقت بادشاہ کا فرمان آیا کہ ان کا سر تن سے جدا کر دیں۔ سر جدا کرنے پر آپ ہنسے اور جان اپنے جان آفریں کے آستانہ جلال پر نثار کر دی۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن — خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

---

[1] اسی بنا پر بعد کے بہت سے صوفیائے عظام نے "ہمہ اوست" یا "وحدۃ الوجود" کا عقیدہ مسلک اختیار کیا۔ [2] پ ۲۵ ع ۳

آپ کے ایک ایک بند سے "انا الحق" کی آواز آتی تھی پھر انہیں پارہ پارہ کر دیا گیا کہ گردن اور پیٹھ کے سوا کچھ باقی نہ رہا، تو سر اور پیٹھ سے بھی "انا الحق" کی آواز آتی تھی۔

دوسرے روز مخالفین نے محسوس کیا کہ وہ بعدِ وفات اپنی حالتِ حیات سے بھی زیادہ فتنے برپا کریں گے، تو انہوں نے اعضا کو جلا دیا، مگر راکھ سے بھی یہی آواز آتی تھی۔ پھر راکھ کو دجلہ میں ڈال دیا، تو پانی میں سے بھی وہی آواز آتی تھی۔ آپ نے وصال سے پیشتر اپنے خادم سے کہہ دیا تھا کہ "ہماری خاک دجلہ میں ڈالیں گے، تو بغداد میں آفت آجائے گی۔ پانی میں بے پناہ جوش آئے گا، اور وہ بغداد کی طرف متوجہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس طوفان میں بغداد بہ جائے، للذا تم ہمارا خرقہ پانی کے پاس لے جانا۔ ورنہ بغداد تباہ ہو جائے گا" چنانچہ خادم نے جب پانی میں جوش دیکھا، تو شیخ کا خرقہ اس کے قریب لے گیا جس سے پانی فوراً رک گیا، اور راکھ خاموش ہوگئی۔

اہلِ طریقت اور شناسانِ حقیقت میں کسی کو ایسی روحانی فتوح حاصل نہیں ہوئیں، جو حضرت حسین منصور حلاج رحمۃ اللہ علیہ کو حاصل ہوئیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں "حسین منصورؒ کو دیکھو کہ ان کے ساتھ راہِ عشق میں کیا معاملہ ہوا۔ خدا جانے ان مدعیانِ حقیقت ناشناس کا حشر کیا ہوگا، جنہوں نے ان پر اتنے ظلم کئے۔" عباسہ طوسیؒ فرماتے ہیں کہ کل میدانِ قیامت میں حسین منصور کو زنجیروں میں جکڑ کر لائیں گے، کیونکہ اگر وہ کھلے ہوں گے۔ تو تمام میدانِ قیامت کو درہم برہم کر دیں گے" عبداللہ خفیف فرماتے ہیں کہ "حسین منصورؒ کے عالمِ ربانی ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔" ان کے دوست اور محرمِ راز حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں "میں اور حلاج ایک ہی چیز ہیں، مگر مجھے لوگوں نے دیوانہ بتا دیا، تو میں نے ان کے فتنوں سے خلاصی پائی، لیکن انہیں عاقل و فرزانہ سمجھ کر ہلاک کر دیا۔" [1]

[1] تذکرۃ الاولیاء ذکر منصور حلاجؒ

منصور حلاج کے متعلق مولانا گرامی کا یہ مشہور شعر نہایت بلیغ و معنی خیز واقع ہوا ہے:

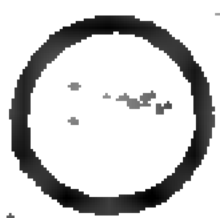
"انا الحق" گفتن منصورؒ تاویلے نمے خواہد
گدا گم مے کند خود را چو دولت مے کند پیدا

یعنی منصور کا انا الحق کہنا کسی تاویل کا متقاضی نہیں۔ ایک گدا جب کہیں سے بالافراط دولت پا لیتا ہے، تو اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے۔"

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

بجام نو کہن مے از سبوئے ریز | فروغ خویش را بر کاخ و کو ریز
اگر خواہی ثمر از شاخِ منصورؒ | بہ دل "لا غالب الا اللہ" فرو ریز

یعنے: اے مسلمان! عہد حاضر کے نئے جام میں وہی پرانی شرابِ عشق ڈال، اور اپنی [۱] ... و باطنی تجلیات کو شہر کے کاخ و کو پر پراگندہ کر دے۔ اگر تو شاخِ منصور سے شیریں پھل چاہتا ہے تو اپنے دل میں یہ ابدی حقیقت منقوش کر لے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مخلوقات پر کوئی حاکم و مختار یا غالب و قاہر نہیں۔"



[۱] یعنی اس کی رعایت اور سوز عشق سے مستفید ہونا چاہتا ہے اگر تو۔

رحمۃ اللہ علیہ

حضرت امام اعظم ابو حنیفہ

چونکہ حضرت امام ابو حنیفہ کے علم و فضل، زہد و اتقا اور تجدید دین کا شہرہ دور دراز تک پھیلتا چلا جا رہا تھا اور مسلمان جوق در جوق آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو رہے تھے، لہٰذا سلطان منصور کو سیاسی طور پر ان کے اقتدار کا خدشہ لاحق ہوا، اور اس نے حیلہ سازیوں سے انہیں محبوس کر دینا چاہا۔ چنانچہ منصور نے حضرت امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کو ۱۴۶ھ میں قید کیا، لیکن اس حالت میں بھی اس کو ان کی طرف سے اطمینان نہ تھا۔ بغداد دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے علوم و فنون کا مرکز بن گیا تھا۔ طالبانِ کمال ممالکِ اسلامی کے ہر گوشے سے اٹھ کر بغداد ہی کا رخ کرتے تھے۔ امام صاحب کی شہرت دور دور پہنچ چکی تھی، اور قید کی حالت نے ان کے اثر اور مقبولِ عام کو بجائے کم کرنے کے اور زیادہ کر دیا تھا۔ بغداد کی علمی جماعت جس کا شہر میں بہت کچھ اثر تھا، ان کے ساتھ نہایت خلوص رکھتی تھی۔ ان باتوں کا یہ اثر تھا کہ منصور نے گو ان کو نظر بند کر رکھا تھا

لیکن کوئی امران کے ادب اور تعظیم کے خلاف نہ کر سکتا تھا۔ قیدخانہ میں ان کا سلسلہ تعلیم بھی برابر قائم رہا۔ امام محمدؒ کہ فقہ حنفی کے دست و بازو ہیں، قیدخانہ ہی میں ان سے تعلیم پائی۔ ان وجوہ سے منصور کو امام صاحب کی طرف سے جو اندیشہ تھا وہ قیدخانہ کی حالت میں بھی باقی رہا جس کی آخری تدبیر یہ تھی کہ بے خبری میں ان کو زہر دلوا دیا۔ جب آپ کو زہر کا اثر محسوس ہوا، تو سجدہ کیا اور اسی حالت میں قضا کی۔ آپ کی وفات رجب سنہ ۱۵۰ھ میں ہوئی۔

ان کے مرنے کی خبر نہایت جلد تمام شہر میں پھیل گئی اور سارا بغداد امڈ آیا۔ حسن بن عمارہ نے کہ قاضی شہر تھے، غسل دیا۔ نہلاتے تھے اور کہتے جاتے تھے: "واللہ تم سب سے بڑے فقیہ بڑے عابد، بڑے زاہد تھے۔ تم میں تمام خوبیاں جمع تھیں تم نے اپنے جانشینوں کو مایوس کر دیا کہ وہ تمہارے مرتبہ کو پہنچ سکیں۔ غسل سے فارغ ہوتے ہوتے لوگوں کی یہ کثرت ہوئی کہ پہلی بار نماز جنازہ میں کم و بیش پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ اس پر آنے والوں کا سلسلہ قائم تھا، یہاں تک کہ چھ بار نماز پڑھی گئی اور عصر کے قریب جا کر لاش دفن ہو سکی۔

امام صاحب نے وصیت کی تھی کہ خیزران کے مقبرے میں دفن کئے جائیں، کیونکہ یہ جگہ ان کے خیال میں غصب شدہ نہیں تھی۔ اس وصیت کے موافق خیزران کے مشرقی جانب ان کا مقبرہ تیار ہوا۔ مورخ خطیب نے لکھا ہے کہ "دفن ہونے کے بعد بھی بیس دن تک لوگ ان کے جنازہ کی نماز پڑھا کئے۔" قبولِ اسلام کی اس سے زیادہ کیا دلیل ہوگی۔

اس وقت ان ممالک میں بڑے بڑے ائمہ مذہب موجود تھے، جن میں بعض

دامام صاحب کے استاد تھے۔ سب نے ان کے مرنے کا رنج کیا، اور نہایت سف آمیز کلمات کہے۔ ابن جریج مکہ میں تھے، سن کر کہا: "انا للہ، بہت بڑا عالم جاتا ہا"۔ شعبہ بن الحجاج نے کہ امام ابو حنیفہ کے شیخ اور بصرہ کے امام تھے، نہایت افسوس یا اور کہا "کوفہ میں اندھیرا ہو گیا"۔ اس واقعہ کے چند روز بعد عبداللہ ابن المبارک بغداد جانے کا اتفاق ہوا۔ امام صاحب کی قبر پر گئے اور رو کر کہا: "ابو حنیفہ خدا تم پر م کرے۔ ابراہیم مرے تو اپنا جانشین چھوڑ گئے، لیکن افسوس تم نے تمام دنیا میں کسی اپنا جانشین نہیں چھوڑا"۔[1]

امام صاحب کا مزار ایک مدت تک بوسہ گاہِ خلائق رہا اور آج بھی ہے۔ سلطان پ ارسلان سلجوقی نے کہ بڑی عظمت و شان کا فرمانروا اور نہایت عادل و فیاض تا، ۴۵۹ھ میں ان کی قبر پر ایک قبہ اور اس کے قریب ایک مدرسہ تعمیر کرایا۔ غالباً بغداد میں یہ پہلا مدرسہ تھا، کیونکہ "نظامیہ" جو تمام اسلامی مدرسوں کا آدم خیال کیا جاتا ہے، وہ اسی سن میں، لیکن اس کے بعد تعمیر ہوا۔ امام صاحب سے متعلق مدرسہ رفعت ور خوبیِ عمارت کے لحاظ سے بھی لاجواب تھا۔ ابو سعید شرف الملک، کہ الپ ارسلان مستوفی تھا، اس کے اہتمام سے عمارت تیار ہوئی۔ افتتاح کی رسم میں بغداد کے تمام علماء اور عمائد شریک تھے۔ اتفاق سے اسی وقت ابو جعفر مسعود جو ایک مشہور شاعر تھا، نکلا اور برجستہ یہ اشعار پڑھے:

الم تر ان العلم کان مبددا　　　فجمعہ ھذا المغیب فی اللحد

---

[1] عقود الاطمان میں یہ تمام تفصیل مذکور ہے۔

كذالك كانت هذه الارض ميتة فانشرها فعل الحميد ابي سعد

یعنی: "کیا تم دیکھتے نہیں کہ علم کس طرح ابتر ہو رہا تھا۔ پھر اس شخص نے اس کو زندہ کر دیا، جو اس لحد میں مدفون ہے۔ اسی طرح یہ زمین مردہ پڑی تھی۔ ابو سعید کی کوشش نے اس کو دوبارہ زندہ کیا"

یہ مدرسہ جو مشہد ابو حنیفہؒ کے نام سے مشہور ہے، مدت تک قائم رہا، اور بڑے نامور علماء اس کے پروفیسر مقرر ہوئے، جن کے نام اور اجمالی حالات "الجواہر المضیہ فی طبقات الحنفیہ" میں اکثر پائے جاتے ہیں۔ ۵۹۳ھ میں حکیم ابو الحجر لس نے جو خلیفہ مقتدر باللہ کے دربار کا ایک مشہور حکیم تھا، اپنی تمام کتابیں اس مدرسہ کے لئے وقف کر دیں[۱]۔ اس مدرسہ کے متعلق ایک مسافر خانہ بھی تھا۔ شائقین علم جو اطراف سے آکر بغداد میں عارضی قیام کرتے تھے، ان کو وہاں سے کھانا ملتا تھا۔ ایشیا کا سیاح ابن بطوطہ جس وقت بغداد میں پہنچا ہے عباسی حکومت کا اخیر زمانہ تھا۔ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے کہ: "اس وقت تمام بغداد میں مشہد ابی حنیفہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے، جہاں سے مسافروں کو کھانا ملتا ہو۔" آج بھی ان کا مقبرہ بغداد کے متبرک مقامات میں سے ہے۔ حال کے شاہ ایران سلطان ناصر الدین قاچار خلد اللہ نے اپنے حالات سفر میں اس کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے کہ میں نے امام ابو حنیفہؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھی، اور نذر چڑھائی۔ علم کی شان دیکھو جس کی بدولت کوفہ کے ایک بزاز نے یہ رتبہ حاصل کیا کہ بارہ سو برس کے بعد آج بھی اس کے مزار پر بڑے بڑے بادشاہوں کے سر جھکتے ہیں[۲]۔



[۱] ابن خلکان ترجمہ یحییٰ بن عیسیٰ بن جزلہ المطبب [۲] "سیرۃ النعمان" از شبلی نعمانی ص ۸۲ تا ۸۳

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

محبوبِ سبحانی قطبِ ربّانی حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی

مرضِ وصال میں حضرت کے صاحبزادہ شیخ عبدالوہاب نے آپ کی خدمت میں عرض کیا: "مجھے ایسی وصیت فرمایئے جس پر میں آپ کے بعد عمل پیرا رہوں۔" آپ نے فرمایا: "تجھ پر واجب ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا رہ اور اس کے سوا کسی سے خوف نہ رکھ۔ نیز اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے امید نہ رکھ اور اپنے تمام کاموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سونپ دے۔ اللہ جل شانہ کے سوا مخلوقات میں سے کسی پر بھروسہ نہ کر، اور اپنی تمام حاجتیں اسی سے طلب کر۔ اپنا یقین و وثوق اسی کی ذات سے خاص کر۔ توحید کو لازمی طور پر اختیار کر کیونکہ توحید پر سب کا اجماع ہے۔" بعد ازاں فرمایا: "جب مومن کا دل اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح ہو جاتا ہے، تو اس سے کوئی شے جدا نہیں رہتی، اور نہ کوئی چیز اس کی تحویل سے باہر جاتی ہے[1]۔" پھر تھوڑے وقفہ سے فرمایا: "میں مغز بلا پوست ہوں[2]۔" اور اپنی اولاد

[1] یعنی طالب مومن تمام اشیائے کائنات کے اسرار جان جاتا ہے۔ [2] یعنی میں سراپا دلِ عالم حقیقت و معرفت بن چکا ہوں اور میرے سینہ میں کثافت کا کوئی دخل نہیں۔

سے فرمایا ؛ میرے پاس سے ہٹ جاؤ، اس لئے کہ میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ، لیکن باطن میں کسی اور ہستی کے ساتھ ہوں۔ تمہارے سوا اور لوگ ہیں، جو اس وقت میرے پاس آئے ہیں[1]۔ ان کو جگہ دو، اور ان کا ادب کرو۔ آج اس جگہ بڑی رحمت ہے، لہٰذا ان آنے والوں پر جگہ تنگ نہ کرو۔" اور آپ اس دوران میں اکثر وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ الخ فرماتے تھے یعنی: "تم پر اللہ کی سلامتی ہو، اور رحمت و برکات ہوں، اور اللہ تعالیٰ ہماری اور تمہاری مغفرت فرمائے، اور ہماری اور تمہاری طرف لطف و کرم سے رجوع فرمائے۔" اسی طرح آپ ایک رات اور ایک دن متواتر فرماتے رہے۔ پھر آپ نے فرمایا ؛ میں کائنات کی کسی چیز سے، کسی فرشتے سے، حتیٰ کہ ملک الموت سے بھی ہرگز نہیں ڈرتا۔ اے ملک الموت! تیرے سوا تو میرا حقیقی والی اور پروردگار ہے، میں صرف اسی سے خائف ہوں۔" اور یہ فرماتے ہوئے آپ نے بلند آواز سے "اللہ اکبر" کا نعرہ فرمایا۔ اور یہ واقعہ اس دن کا ہے، جس دن کی شام کو آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا ہے۔ آپ کے صاحبزادوں حضرت عبدالرزاق اور حضرت موسیٰ سے مروی ہے کہ آپ مرض الموت میں اپنے دونوں ہاتھوں کو مصافحہ کے طور پر دراز کرتے ہوئے فرماتے تھے ؛ "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ توبہ کرو اور صف میں داخل ہو جاؤ۔ میں ابھی تمہاری طرف آتا ہوں۔" پھر آپ نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ؛ "میرے اور تمہارے اور مخلوقات کے درمیان میں زمین و آسمان کی سی دوری ہے۔ لہٰذا تم مجھے کسی پر، اور کسی کو مجھ پر قیاس مت کرو۔" جب آپ کے صاحبزادہ حضرت عبدالرزاق نے آپ سے مرض کی حالت

---

[1] ان سے مراد اللہ تعالیٰ کے فرستادہ فرشتے ہیں۔

اور درد و کرب کی کیفیت پوچھی، تو آپ نے فرمایا: "مجھ سے کوئی شخص کچھ نہ پوچھے، کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک حال سے دوسرے حال کی طرف پلٹایا جا رہا ہوں۔" سادی کہتا ہے کہ آپ کے صاحبزادہ حضرت عبدالعزیز نے آپ سے مرض کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا: "کوئی انسان، جن، اور فرشتہ میرے مرض کو نہیں جانتا اور نہیں سمجھ سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اللہ کا علم محدود و منقطع نہیں ہوتا۔ حکم تو بدل جاتا ہے، لیکن علم نہیں بدلتا۔[1] حکم منسوخ ہو جاتا ہے مگر علم منسوخ نہیں ہوتا![2]

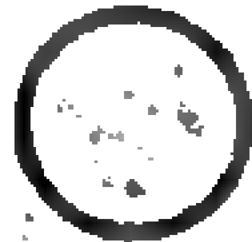
۔ اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے، اور اسی کے پاس اصل کتاب (لوح محفوظ) کا علم ہے۔[3]"

یاد رکھو کہ کلام اللہ میں صفاتِ الٰہی کی خبریں جس طرح آئی ہیں، اسی طرح دائماً برقرار ہیں، اور کائنات میں ان کا عمل جاری ہے۔" پھر آپ کے صاحبزادہ حضرت عبدالجبار نے آپ سے پوچھا: "آپ کے جسم پاک میں کونسا عضو آپ کو تکلیف دیتا ہے؟" آپ نے فرمایا: "میرے تمام اعضا تکلیف دیتے ہیں، مگر میرا قلب کہ اس میں کوئی دکھ نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ کے عشق و تعلق میں بالکل درست ہے۔" اور آپ بار بار فرماتے تھے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہِ۔ میں اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے ساتھ مدد چاہتا ہوں، اور اس ذاتِ حق سے استعانت کرتا ہوں جو فنا اور فوت سے بالکل بے خوف ہے۔ ہر شرک و شر سے پاک ہے وہ

---

[1] یعنی مقتضیات زمانہ، اور ضرورت و کیفیت اقوام کے تحت اللہ تعالیٰ کے احکام تو بدل سکتے ہیں لیکن ان کا علم غیر متغیر، دائمی، ابدی اور قائم بالذات ہے۔ [2] اس کی مثال قرآن حکیم ہی کی "محکمات" اور متشابہات" یعنی ناسخ و منسوخ آیات ہیں۔ [3] یہ ایک آیۃ شریفہ کا مفہوم ہے۔

ذات جو اپنی قدرتِ کاملہ کے سوا تمام مخلوقات پر غالب ہے، اور جس نے بندوں کو موت سے عاجز و مغلوب کیا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔" آپ کے صاحبزادہ حضرت موسیٰ سے مروی ہے کہ آپ نے "تعزز" اور ضعف ونقاہت کے باعث آپ کی زبانِ مبارک اس لفظ کو صحت کے ساتھ ادا نہیں فرمائی تھی۔ آپ نے بار بار "تعزز" فرمایا اور اس لفظ کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچا اور بلند کیا، حتیٰ کہ آپ کی زبانِ مبارک اس کے تلفظ پر صحیح ہوگئی پھر آپ نے تین بار اللہ! اللہ! اللہ! فرمایا اور آواز پست ہوتی چلی گئی اور زبانِ مبارک اوپر کے تالو سے مل گئی۔ یہ نزع کی کیفیت تھی، جس کے بعد آپ کی روحِ مقدس اس قفسِ عنصری سے پرواز کر کے اس محبوبِ حقیقی سے جا ملی، جس کے وصل کے لئے وہ اس قدر مضطرب تھی، رضوان اللہ علیہ و برکاتہٗ دائماً ابداً۔ [1]



[1] "فتوح الغیب" اردو ۲۵۱ تا ۲۵۵

حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

روایت ہے کہ آپ مرض الموت میں یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ (اے ہمیشہ اور قائم رہنے والے پروردگار، میں تیری رحمت کا واسطہ دے کر تجھ سے استعانت کرتا ہوں) کا ذکر بکثرت فرمایا کرتے تھے۔ حضرت کے پاس جو مرید اور عقیدتمند عیادت کے لیے تشریف لاتے آپ انہیں عموماً یہ وصیت فرمایا کرتے کہ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی یعنی "اپنی عاقبت کے لیے توشہ اکٹھا کرو، اور بہترین توشہ نیکو کاری اور پرہیز گاری ہے۔" ذکر و تسبیح کے علاوہ حیات دنیوی کے آخری ایام میں حضرت یہ آیۃ شریف بھی پڑھتے ہوئے سنے گئے:-

یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ﷺ "اے ذکر حق سے اطمینان پانے والی روح! اپنے پروردگار کی جانب لوٹ جا، اور اس حالیکہ وہ تجھ سے راضی ہے اور تو اس ...

(حاشیہ صفحہ ۱۸۰، پ)

سے۔ اب میرے مخلص بندوں میں داخل ہو، اور پھر میری جنت میں داخل ہو!"

بیان کیا جاتا ہے کہ اپنے آخری لمحات میں بھی حضرت کے چہرے پر خوف و ہراس یا اضطراب و بے چینی کے آثار نمایاں نہیں ہوئے، بلکہ لب مبارک یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ میں جنباں تھے کہ متبسم ہو کر جان، جان آفریں کے سپرد کی۔ بلاشبہ ایسی ہی ارواح مقدسہ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

اَلَاۤ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ[۱] یعنے اللہ تعالیٰ کے سچے دوست نہ تو مخلوقات سے خوفزدہ ہوتے ہیں، اور نہ ان پر کبھی رنج و غم طاری ہوتا ہے!

حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ آخری زندگی تک لاہور ہی میں قیام پذیر رہے، اور یہیں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ آپ کا سالِ وفات ۴۶۵ھ ہے۔ انتقال کے بعد مزار مبارک زیارت گاہِ خلائق بن گیا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے آپ کے مزار پر چلہ کیا، اور جب مدت ختم کر کے رخصت ہونے لگے تو سوئے قبر رخ کر کے یہ شعر فرمایا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا ناقصاں را پیر کامل، کاملاں را رہنما

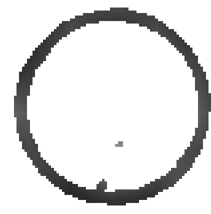
تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ "گنج بخش" کے نام سے شہرت کا سبب یہی ہے۔ عوام داتا گنج بخش کہتے ہیں۔ حضرت فریدالدین گنج شکر نے بھی ان کے مزار پر چلہ کشی کی تھی، جو حضرت کے روحانی و باطنی کمالات کا بین ثبوت ہے۔ ان کا مزار پُرانوار ہر زمانہ میں

حاشیہ از صفحہ ۱۸۷ :- [۱] تفاسیر میں مذکور ہے کہ جب برگزیدہ اولیاء اللہ، صدیقین، شہداء اور صلحائے امت وفات پاتے ہیں، تو فرشتے آخری لمحات میں یہ آیت شریفہ انہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطورِ پیام سناتے ہیں۔

مرجعِ خلائق رہا ہے۔ دارا شکوہ اپنے عہد کے حالات و مشاہدات میں لکھتا ہے:۔

"خلقے انبوہ ہر شب جمعہ بزیارت آں روضۂ منورہ مشرف مے گردند و مشہور است کہ ہر کہ چہل شب جمعہ، یا چہل روز پیہم طواف روضۂ شریفہ ایشاں بکند، ہر حاجتے کہ داشتہ باشد حصول مے انجامد فقیر نیز بزیارت روضۂ منورہ ایشاں، و والدین و خال ایشاں مشرف گشتہ حضرت علی ہجویریؒ را تصنیف بسیار است اما "کشف المحجوب" مشہور و معروف است و ہیچ کس را بر آں سخن نیست کہ مرشدی است کامل۔ در کتب تصوف بخوبی آں در زبان فارسی کتابے تصنیف نہ شدہ [۱]"

ترجمہ: "لوگ گروہ در گروہ ہر شب جمعہ کو اس روضۂ منورہ کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں۔ اور یہ مشہور ہے کہ جو شخص چالیس شب ہائے جمعہ یا چالیس روز مسلسل آپ کے روضۂ شریفہ کا طواف کرے اس کی ہر حاجت پوری ہو جائے گی۔ بندہ بھی حضور کے روضۂ منورہ، والدین اور لواحقین کی زیارت سے مشرف ہوا ہے۔ حضرت علی ہجویری کی تصانیف بہت ہیں، لیکن مشہور و معروف کتاب "کشف المحجوب" ہے۔ اور کسی شخص کو اس میں کلام نہیں کہ "کشف المحجوب" بذات خود ایک مرشد کامل ہے، اور زبان فارسی میں تصوف کے موضوع پر ایسی عمدہ کتاب کبھی تصنیف نہیں ہوئی۔"



[۱] "سفینۃ الاولیاء" ص ۱۶۴

رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

حضرت مولانا جلال الدین رومی

آدمی دیداست، باقی پوست است
دید آں باشد کہ دیدِ دوست است (رومیؒ)

شیخ صلاح الدین کی وفات کے بعد مولانا روم نے حسام الدین چلپی کو جو معتقدانِ خاص میں سے تھے، ہمدم و ہمراز بنایا۔ اور جب تک کہ زندہ رہے انہی سے دل کو تسکین دیتے رہے۔ مولانا ان کے ساتھ اس طرح پیش آتے تھے کہ لوگوں کو گمان ہوتا تھا۔ شاید ان کے مرید ہیں۔ وہ بھی مولانا کا اس قدر ادب کرتے تھے کہ پورے دس برس کی مدت میں ایک دن بھی مولانا کے وضو خانہ میں وضو نہیں کیا۔ شدت کے جاڑے پڑتے رہتے، اور برف گرتی ہوتی، لیکن گھر جا کر وضو کرتے۔ حسام الدین چلپی ہی کی درخواست پر مولانا نے اپنی معرکتہ الآرا مثنوی لکھنی شروع کی۔

۶۷۲ھ میں قونیہ میں بڑے زور کا زلزلہ آیا، اور مسلسل چالیس دن تک قائم رہا۔ تمام

...گ سراسیمہ و حیران پھرتے تھے۔ آخر مولانا کے پاس آئے کہ یہ کیا بلائے آسمانی ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ "زمین بھوکی ہے اور لقمہ تر چاہتی ہے، اور انشاء اللہ کامیاب ہو گی"۔ اسی زمانہ میں مولانا نے یہ غزل لکھی جس میں زلزلہ کی تباہ کاری کی جانب اشارہ بھی ہے۔ حیاتِ انسانی کی ناپائداری کا تذکرہ بھی ہے، اور بعض نکاتِ معرفت بھی ہیں :-

بااین ہمہ مہر و مہربانی — دل می دہدت کہ خشم رانی
تیری اس تمام محبت اور مہربانی کے باوجود — ہم تجھے اپنا دل اس لئے دیتے ہیں کہ تو قہر و غضب کا اظہار کرے
وین جملہ شیشہ خانہ ہا را — درہم شکنی بہ "لن ترانی"
اور تو ہم عشاق کے دلوں کے تمام شیشہ خانہ — یہ کہہ کر توڑ دیتا ہے کہ "تم میرا جلوہ نہیں دیکھ سکتے"
ور زلزلہ است دار دنیا — کز خانہ تو رخت می کشانی
ہماری دنیا کا گھر مسلسل زلزلہ کی زد میں ہے — کیونکہ تو نے اس گھر سے اپنا ساز و سامان اٹھا لیا ہے
نالاں ز تو صد ہزار رنجور — بے تو نہ زیند ہمی تو دانی
اب تو ہزاروں بیمار تیرے ہجر میں آہ و بکا کر رہے ہیں — تو خوب جانتا ہے کہ تیرے بغیر تو یہ زندہ نہیں رہ سکتے۔

ان دنوں مولانا کا معمول تھا کہ سرخ عبا پہنا کرتے تھے۔ اسی زمانہ میں ایک اور غزل لکھی جس میں تلمیح و کنایہ سے اپنی رحلت کا ذکر بھی کیا ہے۔ اسے روحانی کشف و سرور ہی کا ثمرہ کہنا چاہیے :

رو سر بنہ بہ بالیں تنہا مرا رہا کن — ترک من خراب شب گرد مبتلا کن
تو جا کر آرام و راحت کر اور مجھے اکیلا چھوڑ دے — مجھ خراب کشتہ کو جو رات بھر گردش کرتا ہے رنج و غم میں مبتلا رہنے دے
ماییم و موج سودا شب تا بروز تنہا — خواہی بیا ببخشا خواہی برو جفا کن
میں شام سے صبح تک تنہا جنونِ عشق اور غم ہجر میں مبتلا ہوں — اے محبوب! چاہے تو آ کر رحم و کرم کر اور مجھے بخش دے، چاہے تو چھوڑ دے

بر شاہِ خوبرویاں واجب وفا نہ باشد
جو حسینوں کا بادشاہ ہے اس کے لئے وفا لازمی نہیں

اے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن
اے زرد رو عاشق! صبر اور وفا تو ہی کر

درد یست غیر مردن، آں را دوا نہ باشد
درد موت کے علاوہ ایک اور درد عشق بھی ہے

پس من چگونہ گویم، آں درد را دوا کن
میں تجھے کس طرح کہوں کہ تو اس درد کی دوا کر

در خواب دوش پیرے در کوئے عشق دیدم
میں نے کل رات کوئے عشق میں ایک پیر مرد دیکھا

با سر اشارتم کرد کہ عزم سوئے ما کن
جو اپنے سر سے مجھے اشارہ کر رہا تھا کہ اب ہماری طرف آ

گر اژدہاست در رہ، عشق ست چوں زمرد
اگر تیری راہ میں اژدہا بیٹھا ہے، تو فکر کیا، عشق زمرد ہے

از برق آں زمرد ہین دفع اژدہا کن
اس زمرد کی بجلی سے ابھی اس اژدہا کو دفع کر

چند روز کے بعد مولانا کا مزاج ناساز ہوا۔ اکمل الدین اور غضنفر کہ اپنے زمانے کے جالینوس تھے، علاج میں مشغول ہوئے۔ لیکن نبض کا یہ حال تھا کہ ابھی کچھ ہے، ابھی کچھ آخر تشخیص سے عاجز آگئے، اور مولانا سے عرض کی کہ آپ خود مزاج کی کیفیت سے مطلع فرمائیں۔ مولانا سے عرض کی کہ آپ خود مزاج کی کیفیت سے مطلع فرمائیں۔ مولانا مطلق متوجہ نہیں ہوتے تھے، لہذا لوگوں نے سمجھا کہ اب کوئی دم کے مہمان ہیں۔

بیماری کی خبر عام ہوئی تو تمام شہر عیادت کے لئے ٹوٹ پڑا۔ شیخ صدرالدین، جو محی الدین اکبر کے تربیت یافتہ، اور روم و شام میں مرجعِ عام تھے، تمام مریدوں کو ساتھ لے کر آئے، مولانا کی حالت دیکھ کر بے قرار ہوئے، اور یہ دعا کی کہ خدا آپ کو جلد شفا دے۔ مولانا نے فرمایا "شفا آپ کو مبارک ہو۔ عاشق اور معشوق میں ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے۔ کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے، اور نور نور میں مل جائے" شیخ روتے ہوئے اٹھے۔ مولانا نے یہ شعر پڑھا۔

چہ دانی تو کہ در باطن چہ شاہے ہمنشیں دارم
رخ زریں من بنگر، کہ پائے آہنیں دارم

یعنے "تو کیا جانے کہ باطنی طور پر میں کس بادشاہ کا ہمنشیں ہوں۔ تو میرے رخسار زریں کی طرف دیکھ، کیونکہ پاؤں تو اب راہِ زیست میں چلنے سے قاصر ہیں"

حضرت مولانا کے اس قول سے جہاں یہ واضح ہوتا ہے کہ مومن کے نورِ ایمان کا اُس "نور السمٰوات والارض" یعنے اللہ تعالیٰ سے واصل و ملاقی ہونا ہی منتہائے زندگی ہے، وہاں محبوب حقیقی کے لئے ان کا غیر متناہی جذبہ عشق و محبت بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں مدغم ہونے کے لئے کس قدر مضطرب ہیں۔ سچ ہے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا (غالب)

مولانا کے پاس شہر کے تمام امراء، علماء، مشائخ اور ہر طبقہ و درجہ کے لوگ آتے تھے، اور بے اختیار چیخیں مار مار کر روتے تھے۔ ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کا جانشین کون ہوگا؟ اگرچہ مولانا کے بڑے صاحبزادے سلطان بہاؤالدین ولد سلوک اور تصوف میں بڑے پایہ کے شخص تھے، لیکن مولانا نے حسام الدین چلپی کا نام لیا۔ لوگوں نے دوبارہ سہ بارہ پوچھا، پھر بھی یہی جواب ملا۔ چوتھی مرتبہ سلطان ولد کا نام لے کر دریافت کیا گیا کہ ان کے حق میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ مولانا نے فرمایا کہ "وہ پہلوان ہے۔ اس کو وصیت کی حاجت نہیں"

مولانا پر پچاس دینار قرضہ تھا۔ مریدوں سے فرمایا کہ جو کچھ موجود ہے ادا کر کے باقی قرضخواہ سے بحل کرالو۔ لیکن قرضخواہ نے کچھ بھی لینا گوارہ نہ کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ

الحمد للہ یاس سخت مرحلے سے رہائی ہوئی۔ حسام الدین چلپی نے پوچھا "آپ کے جنازے کی نماز کون پڑھائے گا؟" فرمایا مولانا صدر الدین۔ یہ وصیتیں کر کے جمادی الثانی ۶۷۲ھ کی پانچویں تاریخ یکشنبہ کے دن غروب آفتاب کے وقت انتقال فرمایا۔ رات کو تجہیز و تکفین کا سامان مہیا کیا گیا، اور صبح کو جنازہ اٹھا۔ بچے، جوان، امیر، غریب، عالم، جاہل، ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے آدمی جنازے کے ساتھ تھے، اور چیخیں مار مار کر روتے جاتے تھے۔ ہزاروں آدمیوں نے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ عیسائی اور یہودی تک جنازے کے آگے آگے انجیل اور توراۃ پڑھتے اور نوحہ کرتے جاتے تھے۔ بادشاہِ وقت بھی ساتھ تھا۔ اس نے انہیں بلا کر پوچھا کہ "تم کو مولانا سے کیا تعلق تھا؟" وہ بولے کہ "یہ شخص اگر تمہارا محمد تھا، تو ہمارا عیسیٰ اور موسیٰ تھا"۔ صندوق جس میں تابوت رکھا تھا، راہ میں چند دفعہ بدلا گیا، اور اس کے تختے توڑ کر تبرک کے طور پر تقسیم کئے گئے۔ شام ہوتے ہوتے جنازہ قبرستان میں پہنچا۔ شیخ صدر الدین نماز جنازہ پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے لیکن چیخ مار کر بیہوش ہو گئے۔ آخر قاضی سراج الدین نے نماز پڑھائی۔ چالیس دن تک لوگ مزار مبارک کی زیارت کو آتے رہے۔ چنانچہ ان واقعات کو مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد نے اپنی مثنوی میں مختصر طور پر لکھا ہے:۔

پنجم ماہ در جمادِ آخر ... بود نقلانِ آں شہِ فاخر
جمادی الثانی کی پانچویں تاریخ کو ... اس عشق کے شاہ فاخر کا انتقال ہوا

سال ہفتاد و دو بدہ بہ عدد ... شش صد از عہد حضرت احمد
آنحضرتؐ کے عہد سے لے کر ۶۷۲ ہجری ... میں آپ نے اس دارِ فانی سے کوچ کیا

چشم زخمے چناں رسید آں دم ‌ ‌ ‌ گشت نالاں فلک در آں ماتم

اس وقت زمانے کو ایک ایسی مصیبت پیش آئی ‌ ‌ ‌ کہ آسماں بھی ان کے ماتم میں نالاں ہوا

مردم شہر از صغیر و کبیر ‌ ‌ ‌ ہمہ اندر فغاں و آہ و نفیر

شہر کے تمام چھوٹے اور بڑے باشندے ‌ ‌ ‌ سب کے سب ان کے غم میں آہ و بکا کرتے ہوئے باہر گئے

دیہیانِ ہم ز رومی و اتراک ‌ ‌ ‌ کردہ از درد او گریباں چاک

رومی اور اتراک کی آبادیوں سے تمام دیہاتی ‌ ‌ ‌ ان کے رنج و فات میں اپنا گریباں چاک کرتے تھے

بر جنازہ ہمہ شدہ حاضر ‌ ‌ ‌ از سر مہر و عشق از پئے بر

آپ کے جنازہ میں وہ تمام لوگ عشق و محبت ‌ ‌ ‌ کی بنا پر اور حصولِ ثواب کے لئے شامل ہوئے

کردہ او را مسیحیان معبود ‌ ‌ ‌ دیدہ او را جہود خوب چو ہود

عیسائی تو گویا انہیں اپنا معبود سمجھتے تھے ‌ ‌ ‌ اور یہودی انہیں حضرت ہود کی مانند مقدس سمجھتے تھے

عیسوی گفت اوست عیسیٰ ما ‌ ‌ ‌ موسوی گفت اوست موسیٰ ما

ہر عیسائی کہہ رہا تھا کہ وہ ہمارا عیسیٰ ہے ‌ ‌ ‌ اور ہر یہودی کہہ رہا تھا کہ وہ ہمارا موسیٰ ہے

ہمہ کردہ ز غم گریباں چاک ‌ ‌ ‌ ہمہ از سوز کردہ بر سر خاک

سب کے سب رنج و غم سے اپنا گریبان چاک کئے تھے ‌ ‌ ‌ اور سب کے سب اسی درد و اذیت میں سر پر خاک ڈالتے تھے

ہمچناں ایں کشید تا چل روز ‌ ‌ ‌ ہیچ ساکن نشد دمے تف و سوز

اسی طرح چالیس روز تک آہ و بکا ہوتی رہی ‌ ‌ ‌ اور ایک لمحے کے لئے گریہ و نالہ بند نہ ہوا

بعد چل روز سوئے خانہ شدند ‌ ‌ ‌ ہمہ مشغولِ ایں فسانہ شدند

چالیس دن کے بعد وہ مزار مبارک سے گھر کو لوٹے ‌ ‌ ‌ اور آپ کی روح فرسا وفات کا تذکرہ کرتے رہے

مولانا کا مزار مبارک اس وقت سے آج تک بوسہ گاہِ خلائق ہے۔ مشہور سیاح

ابن بطوطہ جب قونیہ میں پہنچا ہے، تو وہاں کے حالات میں لکھا ہے کہ مولانا کے مزار پر ایک بڑا لنگر خانہ ہے، جس سے ہر صادر و وارد کو کھانا ملتا ہے۔[1]

[1] سوانح مولانا روم" از شبلی نعمانی ص ۳۳ تا ۳۷

رحمۃ اللہ علیہ

حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید[1] (اقبال)

چونکہ علامہ اقبال کے آخری ایامِ زندگی کے متعلق ان ہی لوگوں کی معلومات زیادہ صحیح و مستند اور قابلِ اعتماد ہو سکتی ہیں، جو آپ کے محب و عقیدتمند

---

[1] ترجمہ:۔ کیا معلوم الاپے ہوئے نغمے پھر واپس آئیں یا نہ آئیں۔ ارضِ سرزمین حجاز سے نسیم رحمت محبوب کا پیغام لے کر آئے یا نہ آئے۔ اس فقیر کا زمانہ عمر تو ختم ہو لیا، کیا معلوم میرے بعد کوئی اور دانائے راز آئے یا نہ آئے!"

ہونے کے ساتھ ہی ساتھ اس دوران میں ان سے قریب تر ہے، اور مولانا غلام رسول مہر ان میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، للہٰذا ہم شاعرِ مشرق کی یہ دردناک مگر بصیرت افروز روداد ان ہی کے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

"حضرت علامہ مرحوم کی زندگی کے آخری ایام، بالخصوص موت کی صحیح کیفیت اب تک شائع نہیں ہوئی۔ الہٰذا میں ذیل میں اس واقعہ کے صرف چند متفرق حصے پیش کرتا ہوں۔ میں یہ دعوےٰ نہیں کر سکتا کہ یہ آخری دنوں کی کوئی مسلسل سرگذشت ہے۔ البتہ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت مرحوم نے اس دنیا میں اپنے آخری اوقات کس طرح گذارے، اور جب حضور حق تعالیٰ سے طلبی کا فرمان پہنچا تو اسے کس طرح قبول کیا۔

اس ضمن میں حضرت علاّمہ مرحوم کی دو بیماریاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول ہر چار پانچ سال کے بعد دردِ گردہ کا دورہ ہو جاتا تھا۔ دوسرے وقتاً فوقتاً نقرس کا حملہ ہوتا تھا، جو اگرچہ پاؤں کے انگوٹھے تک ہی محدود رہتا تھا، لیکن حضرت مرحوم چلنے پھرنے سے معذور ہو جاتے تھے بلکہ بعض اوقات شدتِ درد کا یہ عالم ہوتا تھا کہ کپڑا بھی انگوٹھے سے چھو جاتا، تو آپ تڑپ اٹھتے۔

کھانا صرف ایک وقت

ان کی عادت برسوں سے یہ ہو گئی تھی کہ حضرت دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ رات کے وقت یا تو تھوڑا سا دلیا دودھ ڈال کر کھا لیا کرتے تھے، یا اس قسم کی کوئی ہلکی سی غذا تھوڑی سی مقدار میں نوش فرما لیتے تھے۔ کبھی بالکل کچھ نہیں کھاتے تھے۔ سردیوں میں رات کے وقت نو بجے کے قریب نمکین کشمیری چائے ضرور پیتے تھے۔

حکیم نابینا:۔

گیارہ بارہ برس پیشتر آپ کو درد گردہ کا حملہ بہت سخت ہوا تھا جو کئی دن تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں خواجہ حسن نظامی کے مشورے کے مطابق حکیم عبدالوہاب صاحب عرف نابینا حکیم کا علاج کرایا جس سے حضرت مرحوم کو بہت فائدہ ہوا۔ اس کے بعد جب کبھی کوئی تکلیف محسوس ہوتی، حکیم صاحب موصوف کو کیفیت لکھ بھیجتے، اور وہاں سے دوا آ جاتی کھانا بہت کم مقدار میں کھاتے، لیکن ہمیشہ اچھی اور خوش ذائقہ چیزیں کھاتے سیخ کے کباب بہت مرغوب تھے، لیکن اگر دو چار روز متواتر سیخ کے کباب کھا لیتے تو تکلیف ہوتی۔

آم سے رغبت:۔

میووں میں انہیں آم بے حد مرغوب تھا۔ ان کے نیاز مند اور دوست دور دور سے قسم قسم کے آم تحفۃً بھیجتے اور وہ اپنے خاص نیاز مندوں کو موسم میں کئی کئی بار آم کھلاتے میاں نظام الدین صاحب رئیس اعظم لاہور موسم میں دو تین بار حضرت علامہ کو بعض خاص نیاز مندوں سمیت باغ میں بلاتے، قسم قسم کے آموں سے ٹوکرے بھر دیئے جاتے اور کئی کئی گھنٹے اشتہ خوری کا سلسلہ جاری رہتا۔ حضرت علامہ فرمایا کرتے تھے کہ "قدرت نے میووں کو ترقی دیتے دیتے انگور بنائے۔ انگوروں میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ آموں کی تخلیق میں پوری کر دی گئی"۔ بعض اوقات فرمایا کرتے تھے کہ میوے صرف چند ہیں، باقی سب میووں کے "اچھوت" ہیں۔"

مرض کا آغاز:۔

وفات سے قریباً چار برس پہلے حلق کا موذی مرض شروع ہوا، جو آخر جان لے کر گیا۔

بظاہر کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی لیکن آواز بیٹھ گئی تھی۔ ابتداء میں اس کی تشخیص کا معاملہ مشتبہ سا رہا۔ بعض ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ جو رگ حلق سے دل کی طرف جاتی ہے اس میں رسولی پیدا ہو گئی ہے، لہذا عمل جراحی کرانا ضروری ہے۔ بعض کی رائے یہ تھی کہ بجلی کے ذریعے اس کا علاج ہونا چاہیے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرت مرحوم دو مرتبہ بھوپال گئے۔ اس لئے کہ وہاں بجلی کے علاج کا مکمل انتظام موجود تھا، اور قریباً ایک ایک مہینہ وہاں رہے۔ حکیم نابینا صاحب کی دوائیں بھی جاری رہیں۔ اس سے تھوڑا سا فائدہ ضرور ہوا لیکن مرض کا ازالہ نہ ہو سکا۔ ایک مرتبہ عمل جراحی کے لئے ولایت جانے پر بھی آمادہ ہو گئے۔

گوشہ نشینی :-

باہر نکلنے کے زیادہ عادی نہ تھے لیکن جب تک آواز کی تکلیف شروع نہ ہوئی تھی، مقدمات کی پیروی کے لئے عموماً ہائی کورٹ چلے جاتے۔ جس روز کوئی پیشی نہیں ہوتی تھی گھر میں بیٹھے رہتے تھے۔ آواز کی تکلیف کے آغاز کے بعد ہائی کورٹ جانا بھی بند ہو گیا۔ میرے علم کے مطابق آخری مرتبہ وہ اس وقت گھر سے باہر نکلے تھے جبکہ اعلیٰحضرت فرمانروائے بہاولپور لاہور تشریف لائے تھے اور انہوں نے دارالافتاء کے قیام کے سلسلے میں مشورے کے لئے حضرت مرحوم کو بلایا تھا۔ یہ انتقال سے غالباً چار مہینے پیشتر کا واقعہ ہے۔

شدید صدمہ :-

۱۹۳۵ء میں ان کی بیگم صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ صدمہ عام حالات کے اعتبار سے ہی بڑا دردناک اور الم انگیز ہوتا ہے۔ لیکن حضرت علامہ مرحوم کے خاص حالات کے اعتبار سے تو اس کی الم انگیزی بیان سے باہر تھی۔ خاص طور پر اس لئے کہ دونوں بچے کم عمر تھے جن نیازمندوں کو علامہ مرحوم کے دلی احساسات سے آگاہی حاصل تھی۔ وہ جانتے

تھے کہ عدیم النظیر صبر و ضبط کے باوجود یہ صدمہ ان کے دل سے ایک لمحہ بھی علیحدہ نہ ہوا، اور اس صدمہ کی وجہ سے ان کی بیماری بڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی گئی۔

وصیّت :-

اکتوبر ۱۹۳۵ء میں ان کے دل کو یقین سا ہو گیا تھا کہ اب زندگی بہت تھوڑی باقی رہ گئی ہے۔ لہٰذا انہوں نے ایک روز تنہائی میں بیٹھ کر اپنے قلم سے وصیت لکھی اور اسے رجسٹرار کے پاس بھیج دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ضروری معلوم ہوا اسے علیحدہ لکھ کر محفوظ کر دیا۔ وصیت میں انہوں نے چار آدمیوں کو بچوں کا گارڈین مقرر فرمایا تھا۔ اوّل چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے۔ دوم منشی طاہرالدین صاحب۔ سوم شیخ اعجاز احمد صاحب سب جج برادر زادہ حضرت علامہ، چہارم خواجہ عبدالغنی صاحب جو بچوں کے حقیقی ماموں تھے۔ افسوس کہ ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ انتقال سے چند روز پیشتر انہوں نے چوہدری محمد حسین صاحب کہ "چوہدری صاحب! میری موت کے بعد علی بخش (حضرت علامہ مرحوم کا دیرینہ وفادار خادم) چند ضروری کاغذات آپ کے حوالے کرے گا۔ آپ انہیں اچھی طرح سے دیکھ لیجئے" چوہدری صاحب حضرت علامہ کے عزیز ترین رفیق اور ان کے خاص رازدار تھے۔ انہوں نے حضرت مرحوم کے ایک ایک ارشاد کی تعمیل اس اہتمام سے کی کہ آج اس کی نظیر ملنا مشکل ہے!

گفتار اور مکالمات :-

مرض اگرچہ اندر ہی اندر بڑھ رہا تھا اور ان کی طبیعت کمزور ہو رہی تھی، لیکن ان کی گفتار اور مکالمات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اسی طرح باتیں کرتے جس طرح تندرستی کے زمانے میں کیا کرتے تھے۔ علمی اور سیاسی مباحث کا انداز بھی وہی تھا

اور نکتہ طرازیاں بھی بدستور جاری تھیں۔ ان کی وفات سے تھوڑی مدت پیشتر ان کے پاس بیٹھ کر یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ دائمی مفارقت کا زمانہ قریب آ گیا ہے

مرض کی شدت :۔

موت سے قریباً ۲ ماہ پیشتر ان کو ضیق النفس، یا کہنا چاہئے کہ تنفس کا شدید دورہ ہوا۔ اتنا شدید کہ ایک روز تکلیف کی زیادتی کے باعث بے تاب ہو کر وہ پلنگ سے گر پڑے۔ یہ ان کے مرض کی شدت کا پہلا محسوس مظاہرہ تھا، جس سے نیازمندوں کے حلقے میں گہرا اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دورہ وقتاً فوقتاً پڑتا رہا کسی وقت کم، کسی وقت زیادہ۔ اس کی کیفیت یہ سمجھ لیجئے کہ دل بیٹھنے لگتا تھا۔ اور سانس لینے میں دقت محسوس ہوتی تھی۔ زبدۃ الحکماء حکیم محمد حسن قرشی پرنسپل طبیہ کالج لاہور نے علاج شروع کیا، جس سے تدریجاً فائدہ ہونے لگا۔ دوروں کا اعادہ بھی کم ہوتا گیا اور ان کی شدت میں بھی نمایاں تخفیف نظر آنے لگی۔

علاج کی عام کیفیت :۔

حکیم نابینا صاحب اس زمانہ میں حیدر آباد میں تھے۔ انہیں مفصل حالات لکھ کر بھیجے گئے۔ پورے حالات کو سامنے رکھ کر حکیم صاحب نے دوائیں تجویز کر کے بھجوا دیں۔ ان کا استعمال بھی شروع ہو گیا۔ ماہر ڈاکٹروں نے بھی کئی مرتبہ معائنہ کیا، جن میں ڈاکٹر محمد یوسف صاحب، ڈاکٹر کپتان الٰہی بخش صاحب، ڈاکٹر جمعیت سنگھ صاحب اور ڈاکٹر یار محمد صاحب خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی دوائیں بھی استعمال کی گئیں۔ ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کی رائے پہلے دن سے یہ تھی کہ مرض لاعلاج ہے۔ وہ فرماتے تھے کہ میرے تجربے کے مطابق اس قسم کے مریض زیادہ سے زیادہ سات آٹھ مہینے زندہ رہے ہیں

بس مئے کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ زیادہ تر غذا اور کمتر دوا کے ذریعہ سے زندگی کے بقیہ ایام آرام و آسائش کے ساتھ گزارنے کا بندوبست کیا جائے۔

علالت کے متعلق سکوت :۔

مصلحتہً یہ رائے حضرتِ علامہ سے مخفی رکھی گئی۔ مصلحت ہی اس امر کی متقاضی ہوئی کہ ان کی علالت کی خبر اخباروں میں شائع نہ ہو۔ اوّل اس لئے کہ حضرت علامہ کی طبیعت مطمئن رہے، کہ طبیعت کا اطمینان و سکون بھی ڈاکٹروں کے نزدیک علاج کا بہت بڑا جزو تھا۔ ثانیاً اس لئے کہ مزاج پرسی کرنے والے ان کے پاس نہ آئیں، تاکہ انہیں کوئی جسمانی و دماغی زحمت نہ ہو اور وہ آرام و سکون کے ساتھ لیٹے رہیں ڈاکٹروں کی رائے یہ بھی تھی کہ انہیں نہ صرف زیادہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں، بلکہ زیادہ غور و فکر سے بھی بچنا چاہیئے۔ لیکن یہ ایک ایسی پابندی تھی، جسے ان کا دماغ آخری دم تک قبول نہ کر سکا۔

معالجوں کی سپاس گذاری :۔

حضرت علامہ مرحوم کے نیاز مندان تمام ڈاکٹروں اور طبیبوں کے دلی ممنون ہیں گے جنہوں نے محض محبت و عقیدت کے جوش میں حضرت مرحوم کا علاج کیا، اور بعض روزانہ، بعض دن میں کئی کئی مرتبہ ان کے دیکھنے کے لئے آتے رہے۔ لیکن اس باب حکیم محمد حسین قرشی سب سے بڑھ کر شکریہ کے مستحق ہیں، جو ضرورت کے وقت دن میں بھی دو ایک مرتبہ حضرت مرحوم کو دیکھنے کے لئے چلے جاتے تھے۔ لیکن شام سے لے کر رات کے بارہ ایک بجے تک تو وہ تقریباً التزام کے ساتھ حضرت مرحوم کے پاس بیٹھے رہتے۔ انہوں نے عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ محض معالج نہ تھے، بلکہ حضرت مرحوم

کی ذاتِ گرامی کے ساتھ گہری محبت و عقیدت رکھتے تھے۔ حکیم صاحب ممدوح کی یہ مخلصانہ خدمت گذاری حضرت علامہ کے تمام نیاز مندوں کے نزدیک انتہائی ممنونیت کا مرجع رہے گی۔

موتیے کا حملہ:۔

گذشتہ سال حضرتِ علامہ کی آنکھ میں موتیا اتر آیا۔ اس وجہ سے مطالعہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ موتیا پختہ ہو جائے گا تو اپریشن کیا جائے گا، لیکن ان کی بیماری بڑھتی گئی اور اپریشن کی نوبت ہی نہ آئی۔ ان کی بینائی کم ہو گئی تھی، یہاں تک کہ ملاقاتی جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جاتا، یا اس کا نام نہ بتا دیا جاتا، وہ اسے پہچان نہ سکتے۔

طبیعت کا نشیب و فراز:۔

مارچ ۱۹۳۶ء کے آغاز میں ان کے پاؤں اور چہرے پر ورم کے آثار نمودار ہوئے، یہ اس بات کی علامت تھی کہ گردے ٹھیک کام نہیں کر رہے۔ دل کے متعلق حکیموں اور ڈاکٹروں کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ وہ پھیل گیا ہے اور اس کی حالت اچھی نہیں۔ لیکن دوا اور غذا کی پابندی سے طبیعت بہتر رہنے لگی، اور فی الجملہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بیماری کے بُرے اثرات زائل ہو رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ اصلاح کی یہ کیفیت مستقل اور دیرپا ثابت نہ ہوئی۔

ضبط و تحمل:۔

حضرت علامہ مرحوم بے حد ذکی الحس تھے۔ وہ ذرا سی تکلیف کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس شدید بیماری کے دنوں میں وہ

ضبط و تحمل کا پیکر بن گئے تھے۔ ان کے مختلف ارشادات پر اب غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے دل کو موت کے قریب کا یقین ہو چکا تھا۔ لیکن نیازمندوں اور خدمتگاروں کے سامنے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جس سے اضطراب اور بے چینی کا اظہار ہو۔ کئی مرتبہ دیکھا گیا کہ ڈاکٹروں نے معائنہ کیا تو حضرت نے فرمایا کہ "مجھے اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں۔ میرے دوستوں اور تیمارداروں سے پوچھیے کہ ان کا اطمینان ہو جاتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ مطمئن ہیں تو میں بھی مطمئن ہوں۔"

دل کا معاملہ :۔

میں اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹروں اور طبیبوں دونوں کی رائے یہ تھی کہ قلب کی حالت اچھی نہیں۔ ایک روز حضرت علامہ مرحوم پر دفعتاً رقت طاری ہو گئی، اور وہ دیر تک روتے رہے۔ جب یہ حالت رفع ہو گئی، اور رقت کا سبب پوچھا گیا، تو فرمانے لگے کہ ایک شعر یاد آگیا تھا، اور وہ یہ کہ

تہنیت گوئید مستاں را کہ سنگ محتسب
بر دل ما آمد و ایں آفت از مینا گزشت

ایک روز ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ "میرے دل کو اچھی طرح دیکھیے۔ اس سے شیطانیاں بھی سرزد ہوتی رہی ہیں۔"

موت کی پیشوائی :۔

۲۰ مارچ کی شام کو میں اور سالک صاحب حاضر خدمت ہوئے تو بظاہر طبیعت کسی قدر بہتر معلوم ہوتی تھی۔ وہ خود فرمانے لگے "اب تو میں کمرے کے اندر تھوڑا سا چل پھر بھی لیتا ہوں۔" ہم نے عرض کیا "خدا کے فضل و کرم سے چند روز میں اتنی صحت ہو جائے گی کہ آپ کوٹھی کے

صحن میں چہل قدمی فرمالیا کریں گے" مسکرا کر کہنے لگے "میں موت سے نہیں ڈرتا، بلکہ خندہ پیشانی سے اس کی پیشوائی کے لئے تیار ہوں" ساتھ ہی اپنا یہ شعر سنایا۔

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

حضرت مرحوم نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ خیال کئی صاحبوں کے سامنے ... انتقال سے چار روز پیشتر ایک جرمن ملاقات کے لئے حاضر ہوا تھا۔ اس سے بھی آپ نے ... فرمایا تھا۔

دماغ کے کمالات :۔

ان کی جسمانی تکالیف بڑھتی گئیں، یہاں تک کہ پلنگ سے اٹھنے کی طاقت بھی نہ رہی۔ اپنے سرہانے اور پائنتی کی جانب کے تکئے پر سر رکھ کر چند منٹ اوندھے بیٹھے رہتے لیکن ان کا دماغ آخری دم تک نہ صرف صحیح سالم رہا، بلکہ اس کے خداداد کمالات زیادہ نمایاں ہوتے رہے۔ ان کی زبان سے جو فقرہ نکلتا، حقائق و معارف سے لبریز ہوتا تھا۔ اسی زمانہ میں انہوں نے "اسلام اور وطنیت" کے متعلق مضمون لکھوایا، جو مولانا حسین احمد صاحب کے ایک بیان کی تنقید پر مشتمل تھا، اور جس کے زیر اثر بعد میں یہ بھی فرمایا تھا کہ :

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی، تمام بولہبی است!

علمی مسائل اور خبریں :۔

انتقال سے صرف چار روز پیشتر میں حاضر خدمت ہوا تو اہل علم کے ساتھ فلسفہ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈارون اور نٹشے کے خیالات و افکار کا خلاصہ حضرت علامہ نے صرف دو تین فقروں میں اس جامعیت کے ساتھ فرما دیا کہ مخاطب حیران رہ گیا۔ وہ اس حالت میں بھی دقیق سے دقیق علمی سوال کا جواب بلا توقف دیتے، اور اس انداز میں دیتے کہ سائل کے دل و دماغ دونوں کو تسکین ہو جاتی۔ اس دور میں بھی خبریں روزانہ سنتے، اور کرید کرید کر ہر خبر کی تشریح پوچھتے۔ دو باتیں آخری دم تک ان کی خاص دلچسپی کا مرجع بنی رہیں۔ اول یہ کہ مسلمانوں کے لئے بہتری کی کوئی صورت پیدا ہوئی ہے یا نہیں، دوسرے یورپ کے سیاسی حالات کی رفتار کیا ہے۔

زیارتِ حرم میں آرزو :۔

انتقال سے چار روز قبل حکیم محمد حسین قرشی کو ایک دو روز کے لئے راولپنڈی جانا پڑا۔ ان کی غیر حاضری میں حضرت علامہ کے بائیں جانب ورم ہو گیا جس سے پھر تشویش پیدا ہو گئی۔ یہ ورم آخری دم تک کم و بیش زائل نہ ہوا۔ میں ۱۷ اپریل کی شام کو حاضر ہوا تو ایک صاحب مرحوم کے پاس بیٹھے تھے۔ میرے پہنچنے پر ان صاحب نے حضرت علامہ کی خدمت میں عرض کیا کہ ابھی تو آپ کو حجاز جانا ہے۔ حضرت فرمانے لگے کہ سہارن پور سے ایک صاحب نے لکھا ہے کہ "میں نے حرم پاک کا طواف کرتے ہوئے بارگاہ ایزدی میں دعا کی تھی کہ آپ کو بھی حرم پاک میں پہنچنا نصیب ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دعا قبول ہو گئی ہے۔" پھر فرمانے لگے کہ "اب بظاہر حجاز پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن دیکھیں خدا کو کب منظور ہے۔" اسی پرخلوص اور مقدس آرزو کی ترجمانی کرتے

ہوئے علامہ مرحوم کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں، جو "رموز" کے آخر میں عرض حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین" کے تحت تحریر کئے گئے ہیں :-

ظلمتم از تاب حق بیگانہ بود[1] — شامم از نور شفق بیگانہ بود

میری ظلمت حق کی تجلیات سے محروم تھی — اور میری شام نور شفق سے تہی دامن

ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند — در صدف مثل گہر پوشیدہ ماند

یہ تمنا میرے دل ہی میں خوابیدہ رہی — اور وہ گویا صدف میں موتی کی مانند پوشیدہ

آخر از پیمانۂ چشمم چکید — در ضمیر من نواہا آفرید

آخر وہ تمنا میرے پیمانۂ چشم سے چھلک گئی — اور میرے ضمیر میں اس نے ہنگامے برپا کر دئے

اے زیاد غیر تو جانم تہی — بر لبش آرم اگر فرماں دہی

اے ہستی کہ تیری یاد کے سوا میرے دل میں کچھ نہیں — اگر اجازت ہو تو میں اس آرزو کو ہونٹوں پر لاؤں

زندگی را از عمل ساماں نبود — پس مرا ایں آرزو شایاں نبود

چونکہ میری زندگی میں اعمال صالح کا ذخیرہ نہ تھا — لہٰذا میرے لئے ایسی آرزو بھی مستحسن نہیں تھی

شرم از اظہار او آید مرا — شفقت تو جرأت افزاید مرا

مجھے تو اس کے اظہار سے بھی شرم آرہی ہے — لیکن تیری شفقت و محبت میری جرأت بڑھا

ہست شان رحمتت گیتی نواز — آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تیری شان رحمت تو تمام دنیا پر بسیط ہے — آرزو یہ رکھتا ہوں کہ میں حجاز میں وفات پاؤں

مسلمے از ماسوا بیگانۂ — تا کجا زنار ہی بت خانۂ

ایک ایسا مسلمان جو غیر اللہ سے بالکل بیگانہ ہو — کب تک ہند کے بت کدہ کا زناری بنا رہے

---

[1] اس موقع پر یہ اشعار میرا اضافہ ہیں۔ (طارق)

حیف چوں او را سر آید روزگار — پیکرش را دیر گیرد در کنار

یہ نہایت الم ناک چیز ہے کہ جب اس کا وقت ختم ہو — تو اس کے بدن کو دیر کدے کی مٹی اپنی آغوش میں لے

از درت خیزد اگر اجزائے من — وائے امروزم خوشا فردائے من

اگر حشر کو تیرے در مقدس سے میرے اجزائے تن اٹھیں — تو حیف ہے دنیا میں میرے آج پر اور مبارک ہے میری کل

فرخا شہرے کہ تو بودی در آں — اے خنک خاکے کہ آسودی در آں

خوش نصیب ہے وہ شہر جس میں تیرا وجود مقدس رہا — محترم اور بلند رتبہ ہے وہ خاک جس میں تو آسودہ ہوا

مسکن یار است و شہر شاہ من — پیش عاشق ایں بود حب الوطن

وہ شہر مدینہ! میرے محبوب اور فرمانروا کا مسکن ہے — لہٰذا عاشق صادق کے لئے تو یہی حب الوطنی ہے

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش — مرقدے در سایۂ دیوار بخش

نبی الرحمتؐ! میرے ستارے کو دیدۂ بیدار بخش — اور اپنے سایۂ دیوار میں مزار مرحمت فرما

تا بیا ساید دل بیتاب من — بستگی پیدا کند سیماب من

تاکہ میرا قلب مضطرب مطمئن ہو جائے — اور میرا سیال پارہ خود میں بستگی پیدا کر دے

با فلک گویم کہ آرامم نگر!

پھر میں فخر کے ساتھ آسمان سے کہوں گا کہ میری آرامگاہ دیکھ

دیدۂ آغازم، انجامم نگر!

تو نے میرا آغاز تو دیکھا تھا اب انجام کی عظمت بھی دیکھ!

طبعی مسکراہٹ:-

۱۹ راپریل ۱۹۳۸ء کی شام کو مولانا غلام مرشد صاحب کی معیت میں حاضر ہوا، تو طبیعت اگرچہ اچھی معلوم نہیں ہو رہی تھی، لیکن حضرت کا چہرہ بدستور بشاش تھا، اور اس پر

ہلکی سی طبعی مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ان کی حرکت سے تشویش ظاہر نہیں ہوتی تھی، اور نہ ان کے چہرے کو دیکھ کر یا باتوں کو سن کر تشویش ظاہر نہیں ہوتی تھی، اور نہ ان کے چہرے کو دیکھ کر یا باتوں کو سن کر دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ موت کا وقت نہایت قریب آگیا ہے۔

۲۰ راپریل کی شام :

تین چار روز سے ان کے بلغم میں خون کی ہلکی سی آمیزش شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کی رائے یہ تھی کہ دل کی طرف جانے والی رگ میں انشقاق کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ یہ بات بھی حضرت علامہ سے مخفی رکھی گئی۔ ۲۰ راپریل کی شام کو ڈاکٹروں نے بتایا کہ اب طبیعت بہت خراب ہے، اور زندگی صرف چند گھنٹوں کی رہ گئی ہے۔ اس وقت مزید مشورے کے لئے کرنیل امیر چند کو بلایا گیا۔ انہوں نے ایک دوا تجویز کر دی، جو رات کے گیارہ بجے کے قریب پلائی گئی۔ حضرت علامہ ڈاکٹروں کی دواؤں کو ویسے بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ان کا ذائقہ اچھا نہیں ہوتا۔ کرنیل امیر چند کی تجویز کردہ دوا کا ذائقہ شاید بہت برا تھا۔ اس کے پیتے ہی طبیعت سخت خراب ہو گئی، اور حضرت مرحوم نے یہاں تک فرمادیا کہ "میں اب زندہ رہنا نہیں چاہتا" جب عرض کیا گیا کہ "حضرت اپنے لئے نہیں، تو دوسروں کے لئے تو آپ کا زندہ رہنا ضروری ہے!" جواب میں ارشاد ہوا "میں اس دوا کے استعمال پہ زندگی کا خواہاں نہیں ہو سکتا" اس کے بعد حکیم محمد حسن صاحب قرشی نے کوئی دوا کھلائی جس سے منہ کا ذائقہ اچھا ہو گیا۔

تین بجے کے حالات :

جب سے گرمی کسی قدر زیادہ ہو گئی تھی، حضرت کا پلنگ خوابگاہ سے نکال کر

ڈرائنگ روم میں لے آئے تھے۔ ۲۰ اپریل کی شام کو فرمانے لگے کہ برآمدہ میں بھی گرمی ہے، اس لیے کوٹھی کے صحن میں پہنچا یا گیا۔ بارہ بجے تک وہاں رہے، پھر ذرا خنکی ہوئی تو ان کے ارشاد کے مطابق پلنگ پر ڈرائنگ روم میں لے آئے متعدد نیاز مند قریباً ایک بجے تک حضرت کے پاس رہے۔ پھر یہ دیکھ کر کہ طبیعت بظاہر بہتر ہے اور حضرت کو نیند بھی آنے لگی ہے، سب رخصت ہو گئے۔ صرف شفیع صاحب اور ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب اور علی بخش و رحمان (حضرت کے ملازم) ان کے پاس رہ گئے۔ راجہ حسن اختر آٹھ نو بجے کے قریب آ رہے تھے، ان سے کسی نے کہہ دیا کہ دوا لانے کے لیے موٹر کی ضرورت ہے، راجہ صاحب موٹر لانے کے لیے واپس چلے گئے، اور رو بجے لوٹے، لہٰذا وہ باہر کوٹھی کے ایک چھوٹے کمرے میں سو گئے۔

درد کی شدت:۔

حضرت علامہ تین بجے تک سوئے رہے۔ پھر اٹھے تو درد محسوس ہوا۔ شفیع صاحب کو اسی وقت حکیم صاحب کی طرف بھیجا گیا۔ حکیم صاحب غالباً اپنے مکان کی بالائی منزل میں سو رہے تھے۔ شفیع صاحب نے نیچے سے آوازیں دیں۔ بعد میں راجہ حسن اختر صاحب سے کہا گیا کہ حکیم صاحب کو لائیں۔ یہ تقریباً پونے پانچ بجے صبح کا واقعہ ہے۔ راجہ صاحب ان مخلص نیاز مندوں میں سے ہیں، جنہوں نے کئی کئی راتیں خدمت گذاری میں بسر کر دیں۔ لیکن اس وقت راجہ صاحب کی زبان سے بلا تکلف نکل گیا کہ "حکیم صاحب غالباً ایک بجے گئے ہیں، کیا تھوڑا سا توقف نہ کر لیا جائے"۔ حضرت مرحوم نے فرمایا "آپ کو معلوم نہیں مجھ پر کیا گذر رہی ہے"۔ یہ سن کر راجہ صاحب فی الفور جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ اس وقت حضرت مرحوم نے اپنے یہ اشعار راجہ صاحب کو سنائے جو

غالباً تین چار ماہ پیشتر لکھے گئے تھے:۔

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

پونے پانچ بجے کی کیفیت :۔

ماجد صاحب کے جانے کے بعد حضرت نے فرمایا "میری چارپائی اب اندر خواب گاہ میں لے چلو" اس لئے کہ فروٹ سالٹ پینے کا ارادہ تھا، تاکہ دو ایک اجابتیں ہو جائیں اور طبیعت درست ہو جائے۔ پانچ بجے کے قریب پلنگ خوابگاہ میں لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالقیوم نے فروٹ سالٹ تیار کیا۔ حضرت علامہ نے پہلے تو گلاس بھرا ہوا دیکھ کر فرمایا "میں اتنا کیسے پی سکوں گا" پھر گلاس لے کر چپ چاپ پی گئے۔ اس دوران میں علی بخش نے پلنگ کے پاس کموڈ لگا دیا۔ اس وقت کمرے میں صرف حضرت علامہ اور علی بخش رہ گئے۔

آخری لمحات :۔

علی بخش بتاتا ہے کہ پہلے آپ نے لیٹے لیٹے پاؤں پھیلا دیئے۔ پھر اوپر کی طرف آنکھیں اٹھا کر مجھے آواز دی، اور دفعتہً دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "اللہ، میرے یہاں درد ہوا" اس کے ساتھ ہی سر پیچھے کی طرف کرنے لگے۔ میں نے (علی بخش نے) فی الفور آگے بڑھ کر بایاں ہاتھ دل پر رکھا اور دائیں ہاتھ سے سر کو تھام لیا۔ اسی دوران میں انہوں نے خود بخود آنکھیں بند کر لیں، منہ قبلہ شریف کی طرف پھر گیا۔ میں نے

شفیع صاحب اور ڈاکٹر عبدالقیوم کو آواز دی جو باہر ٹہل رہے تھے۔ وہ آئے اور دیکھا تو کہنے لگے کہ کلمہ شہادت پڑھو اس لئے کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔ ۲۱ اپریل کی صبح کا آفتاب طلوع کے قریب پہنچا ہوا تھا۔ سوا پانچ بجے کا عمل تھا جبکہ انسانی زندگی کا یہ آفتاب درخشاں غروب ہوا۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصود ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائی سوزِ تمام آیا تو کیا (اقبال)

حضرت علامہ کی خبر وفات آناً فاناً ملک بھر میں پھیل گئی اور ہر مسلمان نے انتہائی رنج و الم کے ساتھ اس سانحہ ارتحال کو قوم و ملت کا ایک ناقابلِ تلافی نقصان سمجھا۔ تھوڑی دیر بعد نہ صرف ان کے دوست احباب اور عقیدت مند، بلکہ عامتہ المسلمین کا ایک جم غفیر کوٹھی کے باہر جنازہ میں شرکت کی سعادت کے لئے جمع ہو گیا۔ زائرین اور شریک جنازہ ہونے والوں کی کثرت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ تابوت میں دونوں طرف کاندھا دینے کے لئے طویل بانس باندھنا پڑے۔ پروردگار عالم نے اس مردِ حق آگاہ کو شاہی مسجد لاہور کے ساتھ ہی دعائے خاص و عام کے لئے وہ برگزیدہ جگہ بخشی، جس کا وہ مستحق تھا۔ قوم کا سچا اور مخلص راہنما قوم کی پاکیزہ ترین زمین میں محو خواب ہے۔ مزار مبارک کی زیارت کرتے ہی اس مرد مجاہد کا یہ شعر اس کی بے لوث اور غیر فانی خدمات کی تصدیق و تائید کرتا ہوا چشم دل کے سامنے جگمگانے لگتا ہے کہ:۔

زیارت گاہِ اہلِ عزم و ہمت ہے لحد میری
کہ خاکِ راہ کو میں نے بتایا رازِ الوندی

شاعرِ ربانی کا مزارِ پُر انوار نہایت خوبصورت سنگِ مرمر اور دیگر قیمتی پتھروں کی آرائش و زیبائش سے تیار کیا گیا ہے۔ لوحِ مزار کی یہ رباعی جو عالمگیر اسلامی اخوت و اتحاد کی مؤثر ترجمان ہے ہر مسلمان کے لئے قابلِ غور و عمل ہے:

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم (پیامِ مشرق)

یعنے "ہم تمام مسلمان بحیثیتِ قوم و ملت نہ تو افغان ہیں، نہ ترک، اور نہ تاتاری وغیرہ۔ ہم تو ایک ہی گلشنِ اسلام سے پیدا ہوئے ہیں، اور ایک شاخِ توحید کے پتے ہیں لہٰذا ہمارے لئے رنگ و بو (حسب و نسب) کا امتیاز قطعی حرام ہے، کیونکہ ہم سب ایک ہی بہار (اسلام) کے پرورش کئے ہوئے ہیں۔"

اسی مفہوم کو ایک اردو شعر میں یوں بیان فرمایا ہے:

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی (بانگِ درا)

چونکہ یہ کتاب مشاہیرِ اسلام کے سانحۂ موت سے متعلق ہے، لہٰذا ہم بالآخر علامہ مرحوم کے چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جو "حقیقتِ موت و حیات" ہی کے موضوع پر تحریر کئے گئے ہیں، اور جن سے بالخصوص "مرگِ مومن" کی امتیازی صفات خصوصاً نمایاں ہوتی ہیں، لہٰذا وہ ہر مسلمان کے قلب میں تزکیۂ روح، جرأت و شجاعت، حفظِ حریت، اور حیاتِ جاوداں کا ولولہ پیدا کر دینے کا موجب ہوں گے:

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست — موت نیرنج و طلسم و سیمیاست!

زندگی تسلیم و رضا ہی سے محکم و توانا ہے — اور موت تو محض ایک نیرنگ، جادو، عارضی نمود اور جادو ہے

بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقامِ اوست مرگ

بندۂ حق گویا شیر ہے اور موت اس کے شکار کا ہرن — مومن کے کتنے ہی مقامات میں سے موت ایک مقام ہے

می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام!

وہ مردِ کامل موت پر یوں حملہ آور ہوتا ہے — جیسے ایک باز کبوتر پر حملہ آور ہو

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ

ایک غلام موت کے خوف سے ہر لمحہ مرتا رہتا ہے — اور خوفِ مرگ سے زندگی اس پر حرام ہو جاتی ہے

بندۂ آزاد را شانے دگر — مرگ او را می دہد جانے دگر!

لیکن ایک بندہ آزاد کی شان ہی کچھ اور ہے — اور موت اگر اسے ایک جانِ تازہ دیتی ہے

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگِ آزاداں ز آنے بیش نیست!

وہ تو اپنی ممکناتِ تسخیر پر غور کرتا ہے موت کے بارے نہیں سوچتا — لہٰذا آزاد لوگوں کی موت ایک لمحے سے زیادہ نہیں

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد — زانکہ ایں مرگ است مرگِ دام و دد

اے مسلمان! اس موت سے بالاتر ہو جا جس کا تعلق لحد سے ہے — کیونکہ ایسی موت تو کیڑوں مکوڑوں کی موت ہے

مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک — آں دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک!

مردِ مومن اللہ تعالیٰ سے وہ موت چاہتا ہے — جو عالمِ سفلی کی اس خاک سے بلند و بالا ہو

آں دگر مرگ انتہائے راہِ شوق — آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

وہ دوسری موت، جو راہِ عشق کی انتہا ہے — اور جو عشق کے میدانِ کارزار میں آخری تکبیر ہے

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰؓ چیزے دگر!

اگرچہ مومن کے لیے موت شیریں و خوشگوار ہے
لیکن فرزندِ علیؓ (حسینؓ) کی موت کچھ اور ہی چیز ہے

سینہ داری اگر درخوردِ تیر
در جہاں شاہیں بزی شاہیں بمیر

لہٰذا اگر تو تیرِ عشق کے لیے سینہ رکھتا ہے
تو دنیا میں شاہیں کی مانند زندہ رہ اور اسی کی طرح مر

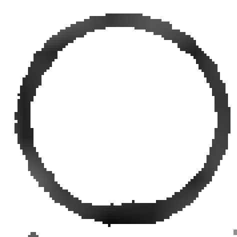
تاب و تب داری اگر مانندِ مہر
پا بنہ در وسعتِ آبادِ سپہر!

اگر تو سورج کی مانند روشنی اور حرارت رکھتا ہے
تو آسمان کی غیر محدود وسعتوں میں جولانیاں کر

زندگی را چیست رسم و دین و کیش؟
زندگی کا اصول و آئین اور طریقِ عمل کیا ہے؟

یک دمِ شیری بہ از صد سالِ میش!
یہ کہ شیر کا سانس بھیڑ کی سو سالہ عمر سے بہتر ہے

(جاوید نامہ)



رحمۃ اللہ تعالیٰ

غازی مصطفیٰ کمال پاشا

من آں علم و فراست با پر کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و تبر بیگانہ سازد مرد غازی را (اقبال)

کمال اتاترک کو "انسان بالائے انسان" محض حسنِ عقیدت کی بنا پر یا جوشِ محبت میں نہیں کہا گیا، بلکہ ان کی مافوق العادت شخصیت اور معجزانہ کارنامے ہر بالغ نظر و انصاف دوست شخص کو مجبور کر رہے ہیں کہ ان کے متعلق یہ حقیقت افروز الفاظ استعمال کئے جائیں کیا تنہا یہی واقعہ انہیں "انسان بالائے انسان" ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ انہوں نے یورپ کے "مردِ بیمار" ترکی کو جس کی طویل بیماری اسے موت کی منزل تک لے گئی تھی، اپنی مسیحا نفسی سے نہ صرف تندرست کر دیا، بلکہ اس قدر قوی الجثہ، رویئیں تن، بہادر اور اولوالعزم بنا دیا کہ اس کا نام سن کر یورپ کی بڑی بڑی طاقتوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے؟ — مصطفیٰ کمال نے معجزنما طاقت سے ترک کے ہر کرم کے قالب میں

اپنی روح حریت پھونک دی، اور یہی وجہ ہے کہ آج مادرِ ترکی کا بچہ بچہ انتہائی فخر و ناز سے اپنے آپ کو مصطفےٰ کمال کہہ رہا ہے۔ اس فوق الانسان شخصیت کے دل میں جو نیا خیال آتا تھا وہ قوم ترکی اور وطن ترکی کی فلاح و بہبود اور اوج و کمال کے لئے ہوتا تھا، اور وہ خیال دیکھتے ہی دیکھتے لباسِ عمل پہن لیتا تھا۔ دیکھ لیجئے تمدنی اصلاحات کے علاوہ جونہی اسے خیال آیا تو ہر چیز ترکی رنگ میں نظر آنی چاہیئے فوراً حکم دے دیا کہ قرآن، نماز، اور اذان کا ترجمہ ترکی میں کر دیا جائے، اور یہ فرائض اسی زبان میں ادا کئے جائیں، تاکہ ہر کس و ناکس ان کے مفہوم و معانی اور قوتِ روحانی سے پوری طرح متاثر ہو سکے، چنانچہ تھوڑے ہی عرصے میں سرزمینِ ترکی کا چپہ چپہ اسی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگا۔ آپ اس فعل کو حکومت ترکی کی اجتہادی غلطی سے موسوم کر کے اس کے خلاف جو چاہیں کہیں، لیکن اس حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کر سکتے کہ ہر چیز کو اپنی زبان میں ڈھالنے اور معمولی سے عمل کے لئے ادھر کمال اتاترک نے اس کا تہیہ کیا، اور ادھر وہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ قوت سے فعل میں آ گئی!۔

غلامِ ہمت بیدار آں سوارانم
ستارہ را بہ سناں سُفتہ در گرہ بستند ؎ (اقبال)

ان کی قوتِ ارادی کا ایک اور کمال دیکھیئے کہ وہ اس موقع پر قوم کو تلقین کر رہے ہیں کہ ہر ترک سپاہی بن جائے، اور صرف اپنے زور بازو پر اعتماد کرے۔ عزت و آبرو

؎ ترجمہ: میں تو ان لوگوں کی بلند ہمتی کا قائل و مداح ہوں جنہوں نے ستارے کو بھی اپنی نوکِ نیزہ میں پرو کر اپنی گرہ میں باندھ لیا۔

کے ساتھ زندہ وہی شخص رہ سکتا ہے جو ملک وملت کی فلاح وبہبود کے لئے ہر وقت جانثار کرنے پر آمادہ رہے"۔ اس تلقین کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ہر ترک مجاہد بن کر شمشیر بکف میدان میں نکل آتا ہے، اور ترکی کی فضا تکبیر وتہلیل کے نعروں اور تلواروں کی جھنکاروں سے گونجنے لگتی ہے پھر جب مقصد حاصل ہو جاتا ہے، اور ترک ذلت و غلامی کا جوا گردن سے اتار پھینکتے ہیں، تو یہی تیغ زن سپاہی امن وصلح کا دیوتا بن جاتا ہے، اور ملک کے گوشے گوشے میں حرب وضرب کے شعلوں کی بجائے سکون وآشتی اور امن وعافیت کے پھول برسنے لگتے ہیں۔ اور ان کی یہ صورتِ حال علامہ مرحوم یہی ہے کہ:۔

مصافِ زندگی میں سیرت فولاد پیدا کر | شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے | گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

(اقبال)

میثاقِ سعد آباد کمال اتاترک کی تاریخِ زندگی کا ایک سنہری ورق اور ان کے میدانِ حیات کا ایک غیر فانی کارنامہ ہے۔ سید جمال الدین افغانی نے اخوتِ ملل اسلامیہ کا جو خواب دیکھا تھا، وہ مدت سے غازی مصطفےٰ کمال کے دماغ میں چکر لگا رہا تھا چنانچہ ایک موقع پر جب کمال نے خلافت وسلطنت کے توڑ دینے کا اقدام کیا تو ہندوستان ومصر کے غلام مسلمانوں نے ان پر زبانِ طعن دراز کی۔ لیکن اتاترک نے جواب میں یہ کہا کہ اخوتِ اسلامی کا نصب العین برقرار رکھنے کے لئے خلافت اور سلطنت کو جیسی کہ مسخ شدہ صورت میں وہ موجود ہیں، قائم رکھنا ضروری نہیں۔ بلکہ پہلے دنیا بھر کے مسلمانوں کو اپنی اپنی جگہ ملکی اور جمہوری آزادی حاصل کرنی چاہیے۔ بعد ازاں انہیں یورپ

کی استعمار پسند اور جابر و مستبد حکومتوں کے اثرات سے کلیتہً آزاد ہو کر اپنے مفاد کی وحدت و یک رنگی کے لئے آپس میں سیاسی، اقتصادی، معاشرتی، اور ثقافتی تعلقات مضبوط و محکم بنیادوں پر قائم کرنے چاہئیں۔"

اس کے بعد اتاترک نے اپنے اس پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے عراق، ایران، اور افغانستان کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی غرض سے ایک معاہدہ مرتب کیا، جن پر ان چاروں اسلامی سلطنتوں کے نمائندگانِ خصوصی نے مہر تصدیق و توثیق ثبت کی یہی معاہدہ تاریخ میں "میثاق سعد آباد" کے نام سے مشہور ہے۔ مقام مسرت ہے کہ وہی اقوام اسلام جو جنگ عظیم سے پہلے کفّار کے شر انگیز پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر ایک دوسری کے خون کی پیاسی ہو رہی تھیں، کمال اتاترک کی مخلصانہ جدوجہد سے شیر و شکر ہو کر اخوتِ اسلامیہ کا روح پرور منظر پیش کر رہی ہیں۔ اس طرح اس ذاتِ جامع المتفرقین نے سید جمال الدین افغانی کے خواب کی تعبیر غازی مصطفےٰ کمال کے ہاتھوں پوری کرا دی۔

آخری ایام:-

کثرتِ کار کے باعث آخر کمال اتاترک بیمار رہنے لگے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۳۶ء میں جب مجلس کبیر ملیۂ ترکیہ کا افتتاح ہوا، تو علالت کے باعث وہ خود افتتاح نہ کر سکے۔ لیکن اپنی تقریر لکھوا کر بھجوا دی، جو نہ صرف ارکانِ مجلس، مجلسِ کبیر ملی سفرائے دول خارجہ، اور ایوان کے باہر لاکھوں انسانوں کے اژدھام نے سنی، بلکہ ریڈیو کے ذریعے سارے ملک میں بھی نشر کی گئی۔ مجلسِ کبیر ملی میں غازی جلال بایار وزیر اعظم نے یہ تقریر پڑھ کر سنائی، جس میں پہلے تو اہم امور داخلہ کا ذکر کیا گیا تھا، پھر ترکی کی خارجہ

حکمتِ عملی واضح کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ ہم عصر حکومتوں سے بلا اختصاص و امتیاز ترکی کے تعلقات خوشگوار ہیں۔ ہمیں نہ کسی حکومت سے دشمنی ہے، اور نہ کسی سے غیر معمولی دوستی۔ ترکی نے اقتصادی پروگرام کی تکمیل کے لئے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ گنی انگلستان سے اور ایک کروڑ ڈھائی لاکھ گنی جرمنی سے قرضہ لیا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ ان رقوم سے مجوزہ پروگرام کے مطابق صنعتی ترقی کے میدان میں گرم تگ و تاز ہو ترکی کو چاہیئے کہ غیروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنی حفاظت آپ کرے، مسلمہ سیاسی اصول و ضوابط امن اور صداقت کو ہاتھ سے نہ جانے دے، اور اپنے ملک میں کسی بیرونی سلطنت کے نفوذ و اثر کو بڑھنے سے نہایت سختی کے ساتھ روک دے گا۔

اخبار "البلاد" بغداد میں کمال اتاترک کے آخری لمحات کے حسب ذیل حالات شائع ہوئے تھے، جو جریدۂ مذکور کے نامہ نگار خصوصی نے استنبول سے بھیجے تھے۔

"۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء کو شام کے وقت اس خبر سے سارے استنبول میں تہلکہ پڑ گیا، کہ اتاترک کی حالت خراب ہو گئی، اور بیماری نے دوبارہ حملہ کیا۔ میں نے گھنٹوں دولمہ بلغ کے چکر کاٹے مگر کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ البتہ ایک فوجی افسر سے اتنا پتہ چلا کہ اتاترک پر دوبارہ فالج گرا۔ آج صبح ان کا ملازم خاص مل گیا جس نے مجھے بتایا کہ ہا گرچہ ڈاکٹروں نے سخت تاکید کر دی ہے کہ اتاترک چالیس دن تک کوئی دماغی کام نہ کریں مگر یہ فدائے وطن و ملت کب خاموش بیٹھنے والا تھا صحت یابی کے دوسرے ہی دن اس نے سرکاری کام کی انجام دہی پہلے سے زیادہ انہماک کے ساتھ شروع کر دی اور بحری فوج کے جدید انتظام کا سارا پروگرام خود مرتب کیا۔ رشدی آراس منع کرتے تھے، لیکن اتاترک یہ جواب دیتے تھے: "بیکار بیٹھنے سے تو یہ اچھا ہے کہ میں وطن و ملت کی خدمت

انجام دیے کر جاؤں!" اتاترک کے اس قول سے تعمیر ملک و ملت میں ان کی انتھک محنت و کاوش اور خلوص کا اندازہ کیا جا سکتا ہے!

۸ر نومبر کو حجاز اور یمن کا ایک وفد عبداللہ مزروع کی سرکردگی میں آیا۔ جو اگرچہ بظاہر مزاج پرسی کے لئے آیا تھا، لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ یمن، شام، اور نجد و حجاز کو معاہدہ سعد آباد میں شریک کیا جائے۔ مصطفیٰ کمال ان سے علی بھر باتیں کرتے رہے، اور سامانِ حرب کی فراہمی اور جنگی جہازوں کی تیاری کے متعلق انہیں مشورہ دیتے رہے۔ رشدی آراس نے دوبارہ عرض کی کہ ذرا آرام فرما لیجئے۔ اتاترک نے جواب دیا کہ "زندگی کا ہر لمحہ بڑا قیمتی ہے۔ معلوم نہیں سانس کب رک جائے۔ لہٰذا اہم امور کو طے کر لوں۔" چنانچہ معاہدہ مرتب کیا گیا، اور شام کے بعد معاہدہ کی کاپی صاف ہو کر پیش ہوئی۔ اتاترک نے سب سے پہلے شرائط پیش کیں، اور یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ "خدا کا شکر ہے کہ آج اتحادِ اسلامی کا پروگرام مکمل ہو گیا، جو خداوند عالم نے میرے سپرد کیا تھا۔" عربی وفد کے ارکان نے اپنے دستخط کر دیئے تو اتاترک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے انگڑائی لی، جس سے جھٹکا آ گیا، اور وہ کرسی پر گر پڑے۔ میں نے دوڑ کر توفیق رشدی کو خبر کی۔ توفیق پاشا نے خاص ڈاکٹروں کو ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے آ کر ٹیکے دیئے، مگر تشنج کے دورے بڑھنے لگے۔ جس وقت دورہ پڑتا تھا، بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی تھی۔ تمام رات بے چینی میں بسر ہوئی۔ ڈاکٹر ٹیکے اور مالش کی تاکید کرتے تھے، مگر کچھ فائدہ نہ ہوتا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے گھنگرو بولنے لگا، اور ایک گھنٹے کے بعد اس بطلِ حریت اور عظیم مجاہد اسلام کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔

انتقال سے تھوڑی دیر پہلے اتاترک نے توفیق رشدی کو روتے دیکھ کر کہا تھا۔

"پیارے دوست! تم پروا نہ کرو۔ میں راضی برضائے مولا ہوں۔ اگر خداوند تعالیٰ کو مجھ سے مزید کام لینا منظور ہے اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت کرنا میری قسمت میں ہے تو میں ابھی ہرگز نہ مروں گا۔ اور اگر میرا وقتِ رحلت آگیا ہے تو میں خوشی سے دنیا کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو تم دنیائے اسلام کو میرا یہ پیغام پہنچا دینا کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ اگر مسلمانوں کو آزاد و با آبرو طور پر زندہ رہنا ہے تو وہ رسولِ عربیؐ کے نقشِ قدم پر چلیں، سادہ زندگی اختیار کریں، محنت و مشقت کو اپنا شعار بنائیں، فضول ٹیپ ٹاپ اور تضیعِ اوقات سے پرہیز کریں، اور اسی طرح فوجی ضبط و نظام سے رہیں، جس طرح کہ فاروقِ اعظمؓ نے پیروانِ اسلام کو عسکری نظام کی تاکید کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق روحانی و اخلاقی قوتوں کو فروغ دینے والا علم حاصل کریں، اور زندگی کا ایک لمحہ بھی بیکار نہ جانے دیں!"

کمال اتاترک کے انتقال پر تمام اقوامِ عالم میں بالعموم اور اسلامی دنیا میں بالخصوص صفِ ماتم بچھ گئی۔ جنازہ شاہانہ تزک و احتشام سے اٹھایا گیا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشکبار نہ ہو۔ کوئی ہاتھ ایسا نہ تھا جو سینہ کوب نہ ہو، اور کوئی دل ایسا نہ تھا جو نوحہ گر نہ ہو۔ تابوت تین دن تک دولمہ باغچہ محل میں مغربی ممالک کے دستور کے مطابق میت کو شاہی لباس پہنا کر کھلے منہ رکھا گیا، تاکہ زائرین صورت دیکھ سکیں اور دعائے خیر کر سکیں۔ چند ترکی جرنیل تابوت کے قریب کھڑے ہو گئے اور جمہوریہ ترکیہ کے چھ مشہور اصول کی رعایت سے وہاں چھ خوبصورت و شاندار شعلیں

روشن کی گئیں۔ ترکی اور غیر ممالک کے زائرین کا تانتا بندھ گیا۔ تیسرے دن جب تابوت اٹھایا جانے والا تھا، لوگ اس خیال سے کہ شاید پھر منہ دیکھنا اور دعائے خیر کرنا نصیب نہ ہو۔ جوق در جوق آنے لگے، اور آن کی آن میں تقریباً پانچ لاکھ سوگوار انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ یہاں تک کہ اس بے پناہ ہجوم کے ریلے میں بیس آدمی جانِ بحق ہو گئے۔ تابوت پر پھولوں کی بارش ہونے لگی، اور اندازہ کیا گیا کہ صرف بیرونی ممالک کے سفیروں نے سترہ ہزار پھولوں کی چادریں پیش کیں۔

مقررہ وقت پر غم زدہ مردوں، عورتوں اور بچوں کے جگر دوز نالہ و شیون کے درمیان تابوت اٹھایا گیا، اور انگورہ میں لے جا کر اس انسان بالائے انسان کے جسدِ مبارک کو آغوشِ لحد میں لٹا دیا گیا۔ لیکن تجویز یہ ہے کہ تابوت کو اناطولیہ کے پہاڑوں میں منتقل کیا جائے۔ جہاں کہ ہر سنگ ریزے سے گوشِ شنوا میں یہ آواز آ رہی ہے کہ رحمت کے موتی برسیں اس کے مزار پر، اور قیامت کے دن شہنشاہ کونین صلعم کی شفاعت کے طفیل حور و غلمان بڑھ بڑھ کر اس پیکرِ حریت و شجاعت کا جس نے دنیا میں قوم ترکی کو موت و ذلت کے جہنم سے نکال کر زندگی و سرفرازی کی ابدی جنت میں داخل کر دیا اس کے بعد کوئی موزوں جگہ منتخب کر کے وہاں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کیا جائے، تا کہ اس کے درو دیوار زبانِ حال سے آئندہ نسلوں کو درسِ حیات دیتے رہیں۔[۱]

ابرِ رحمت ان کے مرقد پر گہر باری کرے
حشر میں شانِ کریمی ناز برداری کرے

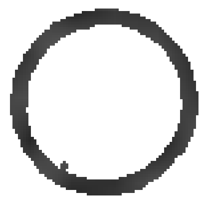
---

[۱] "کمال اتاترک" مصنفہ استاد محمد رفیق ترجمہ کرم الٰہی خاموش صفحہ ۲۸۲ تا ۲۸۶

کمال اتاترک کے جہادِ آزادی اور فتوحات کی داستان تو بہت طویل ہے، اور اس کا یہاں موقعہ بھی نہیں، لیکن ہم اس مردِ مجاہد کے منفرد کردار کو مجمل صورت میں بلا مبالغہ بیان کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ یقینِ محکم، عزم و استقلال، خود اعتمادی، سعی پیہم، اور توکل علی اللہ کا ایک فولادی پیکر تھا، اور وہ اپنے لائحہ عمل اور تسخیر مقاصد میں مخلوق سے کبھی ہراساں نہیں ہوا۔ اس کا ایمان تھا کہ خوف صرف ایک ہی ہستی سے جائز ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔ اس نے ترکوں میں علمی، ذہنی، اور شعوری بیداری ہی نہیں پیدا کی، بلکہ خود عملی مثال قائم کر کے انہیں ناقابلِ مقاومت مجاہد بھی بنا دیا۔ لہٰذا طرازِ عنوان کا یہ شعر اس کے ذہن کی صحیح ترجمانی کرتا ہے کہ:-

من آں علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و تبر بیگانہ سازد مردِ غازی را

"میں اس علم و فراست کو گھاس کے ایک تنکے کے عوض بھی خریدنے کو تیار نہیں،
جو مردِ غازی کو اس کے تیغ و تبر سے بیگانہ کر دے!"



رحمہ اللہ تعالیٰ

محی الدین اورنگ زیب عالمگیر

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ ما را خدنگِ آخریں

(اقبال)

تعلیماتِ قرآن، ارشاداتِ نبویؐ اور سیرتِ خلفائے راشدین سے واضح طور پر ثابت ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک میں مسلمان فرمانرواؤں کا حقیقی مقصدِ حیات تبلیغ اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق ہے، اور اگر کسی مسلمان فرمانروا نے اس نصب العین کی عملی طور پر پیروی نہیں کی، تو بلاشبہ وہ قرآنِ حکیم، تعلیماتِ رسولؐ اور روحِ اسلامی سے باوفا نہیں رہا، بلکہ دنیوی اور مادی اغراض و مقاصد ہی میں محو و مستغرق ہو کر صراطِ مستقیم سے منحرف ہو گیا یہی کیفیت بالعموم شاہانِ مغلیہ کی ہے کہ انہوں نے اپنے طویل دورِ حکومت و اقتدار میں نشر و اشاعتِ اسلام، اور استحکامِ ملتِ بیضا کو تو کوئی توجہ نہیں دی، لیکن ہوسِ ملک گیری،

ذاتِ نفس اور آپس کی سیاسی رسہ کشی میں ضرور الجھے رہے۔ حکومت و اقتدار کے وسیع
ذرائع رکھتے ہوئے اگر وہ منظم طور پر تبلیغ اسلام میں دلچسپی لیتے تو ہندوستان کی بیشتر آبادی
مسلمانوں ہی پر مشتمل ہوتی، اور تقسیم ملک کی بجائے آج یہ تمام برصغیر "پاکستان" ہی کا
نقشہ پیش کرتا!

اس تمہید کا مقصد یہ ہے کہ شاہانِ مغلیہ میں اورنگ زیب عالمگیر ہی ایک ایسی منفرد
شخصیت ہے، جس نے ایک مسلمان فرمانروا کے حقیقی مقصد حیات اور کردار کو
صحیح سمجھ کر اسے عملی طور پر اپنایا۔ وہ شہنشاہ ہوتے ہوئے بھی درویش صفت رہا
اس نے قوم کے بیت المال کو ذاتی اغراض کے لیے کبھی استعمال نہیں کیا، بلکہ اپنی
محنت مزدوری[1] ہی سے بسر اوقات کی۔ اس کی زندگی میں اسراف، تعیش، اور فسق و
فجور نام کو نہیں۔ وہ حقیقی معنوں میں متقی اور عامل بر شریعت تھا، اور دیگر تمام مسلمانوں
کو بھی ہمیشہ اتباعِ شریعت اور تقویٰ کی تلقین کرتا رہا۔ اس نے زبان سے اس قدر
تبلیغِ اسلام نہیں کی، جس قدر "عمل" سے کی ہے، اور یہی زیادہ مؤثر اور کامیاب طریقِ تبلیغ
ہے، جس کا اسلام نے شدت سے تقاضا کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس مردِ حق اندیش نے
دینی مدارس میں خاص دلچسپی لی، علماء کا معاون و سرپرست رہا، اور اقلیم ہند میں ہر طرف
مبلغین اسلام بھیجنے کا خاص اہتمام کیا۔ وہ کفر و شرک اور بدعات[2] کا انتہائی دشمن تھا۔

---

[1] آپ قرآن مجید کی کتابت اور کلاہ کی کڑھائی کا کام کیا کرتے تھے۔ [2] بدعات: وہ تمام اعمال و
رسوم جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قطعی خلاف ہوں، اور جن کا سیرت نبوی (صلعم) میں
کوئی ثبوت موجود نہ ہو۔

اور فسق و فجور کے اسباب فنا کرنے میں ساعی رہتا تھا۔ بعض لوگ عالمگیر پر محض اس لیے معترض رہے کہ اس کی طبیعت میں تشدد بہت تھا، اور اس نے اغیار تو در کنار، اپنوں کو بھی معاف نہیں کیا۔ یہاں پھر وہی سوال اٹھتا ہے کہ اس کا تشدد ذاتی اغراض کے لیے تھا یا غیرتِ دین اور حفظِ ناموسِ شریعت کے لیے؟ — تاریخی حقائق شاہد ہیں کہ اورنگ زیب عالمگیرؒ کا تشدد، خواہ رشتہ داروں سے ہو یا اغیار سے، صرف حفظِ دین، تقویٰ، اور اتباعِ شریعت کے لیے تھا، لہٰذا اس کے سرتاپا اسلامی کردار میں حرف گیری کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ علامہ اقبالؒ نے کیا خوب فرمایا ہے:۔

شاہِ عالمگیرؒ گردوں آستاں
اعتبارِ دودمانِ گورگاں

وہ شاہ عالمگیرؒ جس کا آستانہ آسمان جیسا بلند تھا
اور جو خاندانِ گورگاں[1] کے لئے وجہِ عزت و وقار تھا

پایۂ اسلامیاں برتر ازو
احترامِ شرعِ پیغمبرؐ ازو

مسلمانوں کا رتبہ اس کی ذات سے بلند ہوا
اور پیغمبرِ برحق کی شریعت کو اس کی ذات سے عزت ملی

درمیانِ کارزارِ کفر و دیں
ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

سچ تو یہ ہے کہ کفر اور اسلام کے درمیان جنگ جاری تھی
اس میں عالمگیرؒ ہمارے ترکش کا آخری تیر تھا

تخمِ الحادے کہ اکبر پرورید
باز اندر فطرتِ دارا دمید

الحاد کا بیج جو اکبر نے "دینِ الٰہی" سے بویا
اور پھر اسے دارا کی فطرت میں راسخ کرنے کی کوشش کی

---

[1] گورگاں، لقب ہے شاہ تیمور کا، جو شاہانِ مغلیہ کا جدِ امجد تھا۔ "گورگاں" کے لغوی معنے ہیں وہ شخص جو لائق عیش و عشرت ہو۔

شمع دل در سینہ ہا روشن نبود — ملت ما از فساد ایمن نبود

اس کے باعث سینوں میں شمع دل روشن نہیں تھی — اور ہماری قوم اعتقادی فسادات سے محفوظ نہیں تھی

حق گزید از ہند عالمگیرؒ را — آں فقیر صاحب شمشیر را

لہٰذا اللہ تعالیٰ نے ہندوستان سے عالمگیرؒ کو منتخب کیا — جو عالمگیر جو صاحب حکومت و اقتدار ہو کر بھی طبعاً فقیر تھا

از پئے احیائے دیں مامور کرد — بہر تجدید یقیں مامور کرد

پھر اسے احیائے دین حق کے لئے مامور و مختص فرمایا — تاکہ وہ اس جھگڑے میں یقین و ایمان کی تجدید کرے

برق تیغش خرمن الحاد سوخت — شمع دیں در محفل ما بر فروخت

چنانچہ اسکی برق تیغ نے خرمن کفر و الحاد کو جلا دیا — اور ہماری محفل تاریک میں شمع دین کو دوبارہ روشن کیا

کور ذوقاں داستانہا ساختند — وسعت ادراک او نشناختند

کور ذوقوں نے اسکے متعلق کتنی ہی کہانیاں وضع کر لی ہیں — اور اس کے فہم و ادراک کی وسعت کو سمجھنے سے قاصر ہیں

شعلۂ توحید را پروانہ بود — چوں براہیمؑ اندریں بتخانہ بود

وہ مرد مومن تو شعلۂ توحید ہی کا پروانہ تھا — اور ہند کے بت خانہ میں ابراہیمؑ سا بت شکن تھا

در صف شاہنشاہاں یکتاستے

وہ بادشاہوں کی صف میں بلاشبہ ایک بے مثل شخصیت ہے

فقر او از تربتش پیداستے

اور اس کا فقر اس کی تربت ہی سے آشکار ہے

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس یکتائے روزگار شہنشاہ نے موت کا کیونکر استقبال کیا۔ اور اپنے آخری مواعظ و نصائح میں مسلمانوں کے لئے اصلاح عقائد و اعمال کا کیا ذخیرہ چھوڑا۔ مندرجہ ذیل کوائف ملاحظہ ہوں:۔

اورنگ زیب دکن میں مرہٹوں کے خلاف مصروف جنگ تھا۔ وہیں اس پر بخار کا شدید حملہ ہوا۔ خان خاناں لکھتا ہے:۔

"شہنشاہ کو بیماری نے آگھیرا۔ اس کے اعضا شدت درد سے ٹوٹنے لگے، جس سے مہم کی ناکامی کا شدید خطرہ پیدا ہو گیا۔ لیکن اس نے حوصلہ سے کام لیا، اور بدستور لوگوں کو حوصلہ بندھاتا رہا۔ اس کے مرض نے طول کھینچا، اس پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگے، اور وہ حواس کھو بیٹھا۔ دور دور تک خوفناک افواہیں پھیلنے لگیں۔ دس بارہ روز تک فوج اور کیمپ میں نہایت اضطراب طاری رہا، لیکن خدا کے فضل و کرم سے وہ تندرست اچھا ہو گیا، اور دربار عام میں گاہے گاہے رونمائی کرنے لگا۔ شہنشاہی لشکر دشمن کے ملک میں خیمہ زن تھا، جہاں ننگر تھانہ گھاٹ۔ اگر وہاں ایسا سانحہ رونما ہو جاتا، تو باغی کافروں کے پہاڑی علاقے سے ایک جان بھی سلامت نہ بچ سکتی"۔

شہزادہ اعظم کے نام عالمگیر ایک خط میں خود لکھتا ہے:۔

"میری بیماری سے ساری سپاہ خوفزدہ و پریشان ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ حقیقی فتح و شکست اسی مالک الملک کے ہاتھ میں ہے، اور اگر ان کی نیت میں اخلاص ہے تو وہ ان کی مدد و اعانت کے لیے ہر وقت ان کے ساتھ ہے"۔ شہزادہ محمد اعظم ان دنوں احمد آباد کا صوبہ دار تھا۔ باپ کی بیماری کا سن کر اسے شہنشاہ کے پاس پہنچنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ اس نے والد کے پاس آنے کی اجازت چاہی۔ بہانہ یہ بنایا کہ اسے احمد آباد کی آب و ہوا راس نہیں۔ اورنگ زیب نے اسے جواب میں لکھا کہ "جب شاہ جہاں بیمار تھا، تو میں نے بھی بالکل ایسا ہی خط اسے تحریر کیا تھا جس کے جواب میں اس نے مجھے لکھا تھا کہ ہوائے نفس کے بغیر ہوا انسان کے مزاج کے موافق ہے"۔ اعظم

اعظم پر اس فہمائش کا کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بھاگا بھاگا شہنشاہ کے حضور آ حاضر ہوا جہاں اس کا چھوٹا بھائی کام بخش پہلے سے موجود تھا۔ باپ بستر مرگ پر دراز تھا۔ ادھر بیٹوں میں وراثت کی جنگ جاری ہو گئی۔ اس کی فراست طبع اسے بتلا رہی تھی کہ اگر دو بے زنجیر شیر اسی طرح کھلے چھوڑ دیئے گئے تو اس کے فوت ہو جانے کے بعد فوج دو حصوں میں بٹ جائے گی اور رعایا میں بڑا انتشار برپا ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے کام بخش کو بیجاپور اور محمد اعظم کو مالوہ جانے کے احکام صادر فرمائے۔

شہزادوں کے چلے جانے کے بعد شہنشاہ کی صحت بہت خراب ہو گئی۔ لیکن پانچ چھ روز شدید بیماری کے باوجود وہ فریضہ نماز باقاعدہ ادا کرتا رہا۔ اس حالت میں حمید الدین خان نے ایک خط پیش کیا جس میں نجومیوں کا یہ مشورہ درج تھا کہ شہنشاہ ایک ہاتھی اور چند جواہرات خیرات کرے جس کے جواب میں اورنگ زیب نے لکھا کہ ہاتھی دان کرنا ستارہ پرستوں اور ہندوؤں کا رواج ہے۔ تاہم اس نے چالیس ہزار روپے قاضی اعظم کو تفویض کئے کہ وہ انہیں محتاجوں میں بانٹ دے۔ اسی خط میں اس نے یہ بھی لکھا۔ "بعد وفات اس خاک کے پتلے کو قریب ترین قبرستان میں لے چلو اور تجہیز و تکفین کی کسی بے فائدہ رسوم کے بغیر سپرد خاک کر دو!" مرنے سے پہلے اس نے شہزادہ اعظم کو لکھا۔

"بڑھاپا آ پہنچا اور کمزوری زور کر گئی۔ توانائی میرے اعضا کا ساتھ چھوڑ گئی۔ میں تن تنہا اس دنیا میں آیا تھا اور تن تنہا واپس لوٹ رہا ہوں۔ مجھے معلوم نہیں میں کون ہوں[۱] اور کیا کرتا ہوں۔ زہد و تقویٰ میں گزارے ہوئے دنوں کے

---

[۱] یعنی میں اپنی ہستی کا کما حقہ، عرفان حاصل نہ کر سکا۔

بغیر جو وقت بھی گزر رہا ہے، وہ دکھ اور تاسف کی یاد ہے مجھ سے کسانوں کی بھلائی، اور بہتر انتظام سلطنت کے متعلق کچھ بھی نہ ہو سکا۔ زندگی کا اتنا گراں بہا سرمایہ یوں ہی ضائع ہو گیا۔ میرا پروردگار میرے گھر میں تھا، مگر میں اس کی تجلیاتِ عظمت و جبروت کو نہ دیکھ سکا۔ دنیائے دوں کی زندگی عارضی و ناپائیدار ہے، اور اس کی وقتی دلچسپیوں میں محو ہو کر اپنے خالق و مالک سے غافل ہو جانا صریح حماقت و سفاہت ہے۔ اب ان دنوں کا بھی کوئی نشان موجود جو بیت گئے۔ مستقبل کا سہارا لا حاصل ہے۔ میرا بخار اتر گیا ہے، مگر اس نے مجھ میں ہڈیوں کے ناتواں ڈھانچہ کے بغیر کچھ نہیں چھوڑا۔ میرا فرزند کام بخش بیجاپور جا چکا ہے۔ پھر بھی وہ میرے قریب ہے، اور تم اس سے بھی قریب ہو۔ یاد رہے کہ میں اس دنیا میں اپنے ساتھ کچھ نہ لایا تھا، اور اپنے گناہوں کے بوجھ کے سوا کچھ بھی ساتھ نہیں لئے جا رہا۔ میں نہیں جانتا کہ میں احکم الحاکمین کے دربار میں کس سزا کا مستوجب ٹھہرایا جاؤں گا۔ اگرچہ اس کی بخشش و کرم کا امیدوار ہوں، پھر بھی اپنے اعمال کی بنا پر فکر و پریشانی دامنگیر ہے۔ میرے پوتے بہادر کو میرا سلام الوداع کہنا، اور میری دعائے خیر دینا۔ جاتے وقت میں اسے دیکھ نہ سکا۔ ملنے کی آرزو ادھوری رہ گئی۔ الوداع۔ الوداع۔ الوداع!"

شہنشاہ کی بیماری شدت اختیار کر گئی، تو سلطنت کے ایک بہی خواہ نے اسے ذرا آرام کا مشورہ دیا۔ اورنگ زیب نے اسے جواب میں لکھا:

"ایک بادشاہ کا فرزند اور تخت نشین ہونے کی حیثیت سے مجھے اللہ تعالیٰ نے محض اپنے لئے جینے کو نہیں، بلکہ لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے محنت کی خاطر بھیجا ہے۔ یہ میرا

فرض ہے کہ میں اپنے لیے مسرت و شادمانی کی فکر نہ کروں۔ میری مسرت و شادمانی تو یہ ہے کہ میں اپنی رعایا کی مسرت و شادمانی کا ہر وقت خیال رکھوں۔ سب دانشور اس بات پر متفق ہیں کہ یہ بادشاہ کا فرض ہے کہ مشکلات و خطرات میں وہ سینہ سپر رہے، اور اگر ضرورت پڑے تو تلوار ہاتھ میں لے کر ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہوا مر جائے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے سپرد کیا گیا ہے۔"

تخت نشینی کے ۵۱ برس بعد بروز جمعہ ۲۱ فروری ۱۷۰۷ء کو وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت اس کی عمر نوے سال اور چند ماہ تھی، اور وہ پچاس سال اڑھائی ماہ حکمرانی کر چکا تھا۔ اس کے فوت ہو جانے کے بعد اس کے سرہانے جو کاغذ برآمد ہوا، اس پر تحریر تھا:

"میں جو ٹوپیاں سیتا رہا ہوں ان کے معاوضے سے پانچ روپے دو آنے عل بیگ محل دار کے پاس دھرے ہیں۔ اس سے یہ رقم لے کر میرا کفن بنایا جائے۔ قرآن پاک کے نسخے لکھنے سے مجھے جو حاصل ہوتا رہا ہے اس سے تین سو پانچ روپے میرے بٹوہ میں رکھے ہیں۔ انہیں میرے مرنے کے بعد محتاجوں میں بانٹ دیا جائے۔ اس کے علاوہ جس چیز کی ضرورت ہو اسے شہزادہ علی جاہ کے کارندے سے حاصل کیا جائے۔ اس وقت میری املاک سے وہی میرے پاس موجود ہے۔ اس لئے اچھے برے تجہیز و تکفین کی ذمہ داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔ میرے جنازے کو سفید موٹے گزی کے کپڑے سے ڈھانپا جائے۔ اس پر کوئی چھتر نہ تانے۔ جب جنازہ نکلے تو باجے طوطیاں نہ بجیں، اور نہ ہی باآواز بلند مولود پڑھنے کی بدعت اختیار کی جائے۔"

مرتے دم تک اس کے تمام حواس درست و سلامت تھے۔ اس کا حافظہ اور قوت شناخت حیران کن طور پر صحیح و برقرار تھے۔ آخری دنوں ذرا اونچا سنائی دینے لگا تھا۔ اس کا بھی چند خاص مقربین کے سوا کسی کو علم نہ تھا۔ بروزِ وفات اس پیکر زہد و تقویٰ نے نماز سحر بنہایت خشوع و خضوع سے ادا کی، اور کافی دیر تک یادِ الٰہی میں مصروف رہا۔

اورنگ زیب کی آخری زندگی غم و آلام کا مرقع تھی ۱۷۰۵ء میں اس کی سب سے پیاری بیٹی جہاں زیب گجرات میں وفات پا گئی۔ اس کا باغی بیٹا اکبر جلاوطنی کی حالت میں پہلے ہی مر چکا تھا۔ اس سے پیشتر شہزادی زیب النساء دہلی میں وفات پا چکی تھی۔ اور اب گوہر آرا بیگم اس کے مرنے سے ایک سال قبل اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی۔ گوہر آرا اس کے بھائی بہنوں میں آخری نشانی تھی۔ شہنشاہ نے اس کی خبر وفات سنی تو ٹھنڈی آہ بھر کر بولا "آہ شاہجہان کی اولاد سے میں اور گوہر آرا ہی زندہ باقی تھے وہ بھی داغِ مفارقت دے گئی" اس نے اپنی وصیت میں لکھا۔

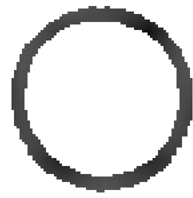
"میرے احباب اور رو رشا کو معلوم ہو کہ میں بے سہارا اس دنیا میں آیا، اور بے سہارا واپس جا رہا ہوں۔ توشۂ عقبیٰ کے لئے جیسے بھی ناقص اعمال ہیں، وہی نجات کا سہارا ہیں۔ میری اولاد میں جسے تخت نشینی حاصل ہو، وہ کام بخش کو ہرگز نہ ستائے۔ آزاد خاں سے بہتر کوئی وزیر نہیں۔ خادمان سلطنت میں دیانت خاں دیوانِ رکن سے بہتر کوئی فرد نہیں۔ میرے بعد میرے خاندانی ملازموں کو برطرف نہ کیا جائے، اور نہ ہی انہیں ستایا جائے۔"

ابوالمظفر محی الدین اورنگ زیب عالمگیر کو دولت آباد کے قریب خلد آباد میں دفن

کیا گیا ،جہاں شاہ ذاری ظفر کے علاوہ کئی اور روحانی پیشوا پہلے ہی ابدی نیند سوئے ہوئے تھے بحسب ومبیت اس کے مزار کی سادگی و بے تکلفی، اور اس کے پس منظر اس کی درویشانہ زندگی دیکھ کر بلاشبہ کہنا پڑتا ہے کہ :۔

در صفِ شاہنشہاں یکتا ستے
فقرِ او از تربتش پیدا ستے

(اقبال)



مولانا محمد علی جوہر

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُر سوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

(اقبال)

آزادیٔ ہند کی تاریخ میں مولانا محمد علی جوہر کی بے مثل قربانیاں اور مخلصانہ خدمات، غیر فانی اور ناقابلِ فراموش رہیں گی۔ آپ اس ملک کے لئے نہ صرف مکمل آزادی کے خواہاں تھے، بلکہ بالخصوص مسلمان قوم کے لیے اس کے دیرینہ اور روائتی "حقوقِ خلافت" کے سرگرم طلبگار بھی۔ مولانا خلافت راشدہ کا احیاء محض مسلمانانِ ہند میں نہیں بلکہ تمام اسلامی ممالک میں چاہتے تھے، اور اس مقدس جہاد میں انھوں نے اپنا تن من دھن سب کچھ وقف کر رکھا تھا۔

چنانچہ برطانیہ اور اس کے حلیفوں سے مولانا کے واضح اور غیر مبہم مطالبات یہ تھے کہ:

۱۔ ملکی اور جغرافیائی بنا پر خلافت کے ٹکڑے نہ کئے جائیں، اور خلیفہ کو دین کی حفاظت کے لیے کافی دنیاوی اقتدار و قوت حاصل ہو۔

۲۔ تمام عرب میں قطعی اسلامی حکومت ہو، اور اس پر کوئی محافظ یا نگران نہ ہو۔ رسول اللہؐ کے ارشاد کے مطابق بالخصوص جزیرۃ العرب میں غیر مسلم آباد نہ رہنے پائیں۔

۳۔ جس طرح خلفائے اسلام آج تک مقدس مقامات کے محافظ و کلید بردار رہے ہیں، اسی طرح وہ آئندہ بھی رہیں۔

آزادیٔ ہند اور مذکورہ بالا مطالبات کی تلقین اور نشر و اشاعت کے لئے مولانا نے متعدد بار یورپ کے مختلف ممالک کا سفر بھی کیا، اور وہاں کے باشندوں کو تقریر و تحریر کے ذریعے اپنے جائز مطالبات کی اہمیت و معقولیت سے آگاہ بھی کیا۔ اکثر جگہ پبلک گو متاثر اور قائل ہوئی، لیکن افسوس کہ حکومت برطانیہ اپنے سامراجی اور سیاسی تقاضوں کی بنا پر قائل نہ ہو سکی۔ بہرکیف مولانا محمد علی فقید المثال عزم و استقلال اور جذبۂ حریت رکھنے کے باعث کسی بھی مخالف و ناساعد صورتِ حال سے مایوس ہرگز نہیں ہوئے، بلکہ اپنے نصب العین کے لئے مسلسل جد و جہد جاری رکھی۔ ان مقاصد کے لئے آپ دو پرچے "ہمدرد" اور "کامریڈ" کے نام سے جاری کئے، اور ان کے ذریعے اپنے نظریات و مطالبات کی نشر و اشاعت فرماتے رہے۔ مولانا بلاشبہ اپنی قوم و ملت کے مستقل اور جداگانہ حقوق کے زبردست محافظ و موید تھے اور ان کی "خلافت" کا واحد مقصد بھی یہی تھا کہ بحیثیتِ قوم مسلمانوں کے روایتی، ملی اور اجتماعی حقوق کہیں بھی تلف نہ ہونے پائیں۔ لیکن انہوں نے کانگریس سے الحاق کیا تو محض آزادیٔ ہند کے نصب العین کے لئے، تاکہ ایک کثیر التعداد ہمسایہ قوم کے تعاون سے پہلے غلامی کی زنجیریں

نوکاٹ پھینکیں۔ اس جہادِ آزادی کے دوران کئی مرتبہ آپ کو اسیرِ زنداں بھی کیا گیا، اور حالات کے نشیب و فراز میں اہل و عیال سمیت بڑے بڑے مصائب برداشت کیے۔ فرمایا کرتے تھے کہ "قومی مصیبتوں نے ذاتی دکھوں کو اس طرح نگل رکھا ہے جیسے حضرت موسیٰؑ کے عصا نے جادوگروں کے سانپوں کو نگل لیا تھا"

چونکہ حصولِ آزادی کے لیے ہندو مسلم اتحاد برطانیہ کے لئے ایک زبردست خطرہ تھا، للذا حکومت نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی دیرینہ پالیسی کی بنا پر ایک سمجھی بوجھی سازش کے تحت ہندوستان میں ہر طرف ہندو مسلم فسادات برپا کرانے شروع کر دیئے، اور ان فسادات کے بانی وہی لوگ تھے جنہیں ذریتِ ابلیس کہا جا سکتا ہے اور جو ہر عہد میں ملک و ملت کے غدار رہے ہیں!

بہرکیف فسادات سے دونوں قوموں میں انتہائی منافرت پیدا ہو گئی۔ اور قوموں کی جدائی کے ساتھ ہی ساتھ مولانا کو بھی کانگرس سے بے تعلق ہونا پڑا۔

کانگرس سے علیحدگی:۔

مولانا محمد علی بیمار تھے اور اپنا علاج کرانے یورپ گئے ہوئے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی فضا کے رنگ کو دیکھ کر وہ علاج بیچ ہی میں چھوڑ کر واپس آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی نہرو رپورٹ کی مخالفت کی۔ یہ رپورٹ شائع ہوئی تو ہندو مسلم ہنگامے اور بھی بڑھ گئے لیکن کانگرس نے مولانا محمد علی کی زبردست مخالفت کی بھی پرواہ نہ کی اور نہرو رپورٹ منظور کر لی۔ اس پر مولانا کانگرس سے اور بھی بددل ہو گئے۔

وہ کانگرس کی مخالفت پر اس لئے تل گئے کہ اس نے نہرو رپورٹ کو منظور کر کے مکمل آزادی کے آدرش کو چھوڑ دیا، اور مسلمانوں کے مطالبے بھی منظور نہ کیے۔ مولانا نے اس

موقع پر ایک دردناک بیان شائع کیا۔ اس بیان میں انہوں نے کانگرس سے اپنی مخالفت کے وجوہ پوری تفصیل سے بیان کئے، اور کانگرس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

مسلم کانفرنس:۔

کانگرس کو چھوڑنے کے بعد مولانا محمد علی مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی کانفرنس میں شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس سر آغا خاں کی صدارت میں دہلی میں منعقد ہوئی۔ قوم پرست مسلمانوں نے اس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ سر محمد شفیع اس کانفرنس کے روح رواں تھے۔ مولانا اور سر محمد شفیع ایک دوسرے کے سیاسی مخالف تھے، لیکن مسلمانوں کے اجتماعی مفاد نے ان میں سمجھوتا کرا دیا۔ سر محمد شفیع نے مسلمانوں کے مطالبات واضح کئے، اور اعلان کیا کہ اگر انہیں منظور نہ کیا گیا، تو مسلمان کسی آئین کو قبول نہیں کریں گے۔

مولانا محمد علی نے اس قرارداد کی حمایت کی، اور فرمایا کہ میں انگریزی حکومت سے بیزار ہوں۔ میں دوسروں کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ میرے ہم خیال ہو جائیں۔ میں قوم و ملت کے جائز مطالبات ٹھکرائے جانے پر انگریزی حکومت سے اس قدر بیزار ہوں کہ مجھے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کی غلامی بھی قبول کرنی پڑے، تو میں اسے قبول کر لوں گا۔" اس کے بعد انہوں نے کہا کہ "میں نے ابھی تک صلح کا دروازہ بند نہیں کیا۔ میں صلح کو پسند کرتا ہوں، اور امن و اتحاد کا حامی ہوں۔ بشرطیکہ اس میں میری اپنی ملت کے مفادات اور غیرت و حمیت کو صدمہ نہ پہنچے۔" ان کا اشارہ ہندوؤں کی طرف تھا۔

آخری سفر:۔

بالآخر برطانوی حکومت نے ہندو اور مسلم رہنماؤں کی ایک گول میز کانفرنس لندن میں بلائی، تاکہ دونوں فریق آپس میں کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں تو انہیں کچھ سیاسی اختیارات

دے دیئے جائیں۔ مولانا محمد علی عرصے سے بیمار تھے، لیکن وہ اس کانفرنس کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ عرصہ دراز کی بیماری اور کمزوری کے باوجود انگلستان گئے انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں میں سمجھوتا کرانے کی بہت کوشش کی، لیکن انہیں کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے باوجود انہوں نے ایک ایسی تجویز تیار کی تھی جسے دونوں فریق قبول کر لیتے لیکن عمر نے وفا نہ کی۔

مولانا محمد علی نے گول میز کانفرنس کے سامنے جو تقریر کی، وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھی جانے کے قابل ہے، کیونکہ ان کی اس آخری تقریر کا ہر ہر لفظ صداقت، حریت پسندی اور حب الوطنی کے مقدس جذبات سے لبریز ہے۔ انہوں نے برطانیہ کے ارباب حکومت سے خطاب کرتے ہوئے کہا:-

"میں آپ سے نوآبادیات کا درجہ لینے نہیں آیا ہوں۔ میں مکمل اور مستقل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں۔ میں آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں جب اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو۔ میں غلام ملک میں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔ مجھے ایک غیر ملک میں، جسے آزادی کا شرف حاصل ہے، غلامی کے مقابلے غربت کی موت منظور ہے۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے، تو پھر آپ کو مجھے یہاں قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا، اور قدرت کو ان کی حریت پسندی اس قدر محبوب ہوئی کہ وہ ایک غلام ملک میں زندہ واپس نہ آسکے۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے باوجود مولانا محمد علی نے آرام نہ کیا، اور آزادی کے حصول میں ہر ممکن طریق پر جدوجہد کرتے رہے۔ تکان اور کمزوری

...ندر پیوند ہوگئی، اور باون سال کی عمر میں یہ "ٹوٹی ہوئی کشتی کا ملاح" دفعتہً ہمیشہ کی نیند سو گیا۔[1]
... آخری دم تک "مکمل آزادی" کے نصب العین سے دست بردار نہ ہو سکا حتیٰ کہ
... غلامی خود بخود ختم ہو گئی :-

قید ہے قیدِ غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کب ہو خاتمہ اس قیدِ بے میعاد کا! (جوہر)

ایک اور شعر فرماتے ہیں :-

میرے لہو سے خاکِ وطن لالہ زار دیکھ
اسلام کے چمن کی خزاں میں بہار دیکھ

مولانا محمد علی کی وفات سے تمام اسلامی دنیا میں کہرام مچ گیا، اور ہر مسلمان نے گہرا صدمہ محسوس کیا۔ طے یہ پایا کہ ملتِ بیضا کے اس جلیل القدر قائد اور پیکرِ حریت کو بیت المقدس میں سپردِ خاک کیا جائے۔ چنانچہ ہوائی جہاز کے ذریعہ ان کی لاش وہاں پہنچائی گئی، اور آپ کو سرزمینِ انبیاء میں دفن ہونے کی قابلِ رشک سعادت نصیب ہوئی۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ
علامہ اقبال نے مولانا کے سانحۂ ارتحال پر ان کے شایانِ شان کس قدر رقت انگیز نظم ارشاد فرمائی ہے :-

---

[1] مولانا محمد علی جوہر - مولفہ حسن اعرانی صد ۶۴ تا ۶۷

محمد علی

یک نفس جانِ نزارِ او تپید اندر فرنگ
تا شرہ بر سیم زنیم از ماہ و پروین در گزشت

اے خوشا مشتِ غبارِ او کہ در جذبِ حرم
از کنارِ اندلس و از ساحلِ بربر گذشت

خاکِ قدس او را بہ آغوشِ تمنا در گرفت
سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

مے نگنجد جز بہ آں ہنگامے کہ پاک از رنگ و بوست
بندۂ کو از تمیزِ اسود و احمر گذشت

جلوۂ او تا ابد باقی بہ چشمِ آسیاست
گرچہ آں نورِ نگاہِ خاور از خاور گذشت

(اقبال)

علامہ سید جمال الدین افغانی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

(اقبال)

کلام اللہ کی متعدد آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ حقیقت پے در پے واضح کی گئی تھی کہ مسلمانوں کے عروج و ترقی، آزادی و اقتدار، حکم و غلبہ، اثر و نفوذ اور ملی استحکام و استقلال کی بنیاد عالمگیر اخوت و اتحاد پر رکھی گئی ہے اور اس اتحاد و یک جہتی کے بغیر زوال و تنزل یقینی ہے۔ چنانچہ تاریخ میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی عملی طور پر تصدیق کر دی۔ جب تک ان میں اخوت و اتحاد کا جذبہ رہا، وہ ہر جگہ آزاد و مختار اور صاحب حکومت و اقتدار رہے، لیکن جوں جوں نفاق و اختلاف پیدا ہوتا گیا توں توں وہ غلامی، اقتصادی بدحالی، اور ذلت و نکبت میں مبتلا ہوتے چلے گئے

قرآن حکیم میں ملت کے اجتماعی اتحاد و اتفاق اور اخوت و مودت کی جو عظمت و اہمیت اور افادیت بیان کی گئی ہے اسے اجاگر کرنے کے لیے یہاں بعض آیات درج کی جاتی ہیں

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (پ ۴ : ع ۲)

اے مسلمانو! سب کے سب مل کر اللہ کی رسی (قرآن حکیم) کو مضبوطی سے پکڑ لو[1] اور ملت اسلامیہ کے بعد آپس میں نفاق و اختلاف مت پیدا کرو۔ اور خود پر اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت یاد کرو کہ جب تم اسلام سے پیشتر ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے (بعد قبول اسلام) تمہارے دلوں کے درمیان محبت و الفت پیدا کی اور تم سب اس کے فضل و کرم سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ وَاصْبِرُوا إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (پ ۱۰ : ع ۲)

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کامل فرمانبرداری کرو اور آپس میں دینی یا سیاسی موضوعات پر جھگڑا اور نفاق مت پیدا کرو، کیونکہ اس طرز عمل سے تم پست ہمت اور پراگندہ ہو جاؤ گے اور دشمنوں کے مقابل تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر سے کام لو، کیونکہ اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

---

[1] یعنے عقائد اسلامیہ پر متفق ہو کر قرآن کے اوامر و نواہی پر عمل کرو۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝
(پ ۴ : ع ۲)

اے مسلمانو! ان لوگوں (یہود و نصاریٰ) کی مانند مت ہو جانا جنہوں نے دین حق کے متعلق، اللہ تعالیٰ کی واضح نشانیاں پالینے کے بعد بھی آپس میں نفاق پیدا کیا اور دین میں طرح طرح کے مصنوعی اختلافات وضع کرلئے، اور ایسے تفرقہ انگیز لوگوں کے لئے بڑا عذاب ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝
(پ ۲۶ : ع ۱۳)

بلاشبہ دنیا کے تمام مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں، لہٰذا آپس میں محبت و اخوت کے جذبات کو فروغ دو اور مسلمانوں کے درمیان صلح کرادیا کرو۔ اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (پ ۲۶ : ع ۱۴)

اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک مرد (آدم) اور ایک عورت (حوا) سے پیدا کیا، اور ہم نے تمہیں مختلف ذاتیں، برادریاں اور قبیلے محض اس لئے بنایا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، ورنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو تم میں سے وہی شخص زیادہ معزز و محترم ہے جو زیادہ نیکوکار اور پرہیزگار ہے۔ اور اللہ تمہارے عمل سے خوب واقف اور باخبر ہے۔

چنانچہ علامہ سید جمال الدین افغانی مسلمانانِ عالم کے اسی کامل اور مستقل اتحاد کے زبردست داعی تھے، اور مسلمانوں کے درمیان رشتہ اخوت و اتحاد کو محکم و پائندہ کرنا انہوں نے اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنا لیا تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جب تک تمام ممالک اسلامیہ کے درمیان بے لوث اور مخلصانہ اتحاد پیدا نہیں ہو جاتا، ہر قسم کے معاشرتی، اقتصادی، اجتماعی، اور سیاسی نقائص موجود رہیں گے جو ان کی غلامی اور زوال و ذلت پر منتج ہوں گے۔ لیکن بدرجہ اخوت و اتحاد کے مستحکم ہوتے ہی تمام انفرادی اور اجتماعی معائب از خود نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اپنے اسی مقدس مشن کی تشریح و توضیح، نشر و اشاعت اور تعمیل و تکمیل کے لئے انہوں نے متعدد بار بلاد اسلامیہ مثلاً حجاز، مصر، ترکی، ایران، بغداد، بصرہ، قسطنطنیہ وغیرہ بھی تشریف لے گئے۔ ہندوستان کا دورہ بھی کیا، اور پھر لندن، پیرس اور جرمنی کی سیاحت بھی کی۔ تاکہ وہاں کے سیاستدانوں، مدبروں اور دانشوروں پر اپنی قوم کے فطری، تمدنی اور معاشرتی حقوق آزادی و اتحاد کو واضح کرتے ہوئے اپنے موقف کے لئے تائید و حمایت حاصل کریں۔

بالآخر سلطان عبدالحمید والی ترکیہ نے جسے اپنے خصوصی نقائص و معائب اور سیاسی کمزوریوں کی بنا پر ان کے مشن سے انتہائی خوف و خدشہ رہتا تھا، انہیں نظر بند کر دیا، اور ان پر ایسی ناروا پابندیاں عاید کر دیں، جن کے خلاف اس ضیغمِ حق کو تا دمِ واپسیں رنج و شکوہ رہا۔ سلطان عبدالحمید یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کے ذاتی نقائص و معائب اور حکومت کے زوال و انحطاط سے متعلق تحریر و تقریر میں کچھ نہ کہیں، اور خاموشی اختیار کریں، لیکن سید صاحب جیسا حق آگاہ اور حق گو شخص محض سلطان سے خائف ہو کر یہ پابندی کیونکر قبول کر سکتا تھا؟ ———

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی! (اقبال)

کفار اور مشرکین تو آغازِ اسلام ہی سے مسلمانوں کی عالمگیر اخوت اور اتحاد و اتفاق کے دشمن رہے ہیں، اور اس نصب العین کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہے ہیں، لہٰذا اگر انہوں نے علامہ جمال الدین افغانی کے مشن کی تکمیل میں ان سے تعاون نہیں کیا، تو یہ چنداں تعجب کی بات نہیں، لیکن دیکھنا یہ ہوگا کہ خود مسلمان حکمرانوں نے جن پر ملت کی تعمیر و ترقی کا انحصار ہوتا ہے، ان کے مقدس مقاصد سے کہاں تک تعاون کیا، اور اس جدوجہد میں ان کی کسی قدر حوصلہ افزائی کی۔ اس کا جواب خود ان کے حسرتناک الفاظ میں یہ ہے کہ:۔

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اپنے پھل لانے والے بیج سلطنت و حکومت کی سرزمینِ شورہ زار میں بکھیر کر انہیں برباد و لاحاصل نہ کرتا۔ افسوس کہ میں نے سلطنت کی کھیتی میں جو کچھ بویا، وہ نمودار اور بارآور نہ ہو سکا، کیونکہ یہ زمین ہی میری تخم ریزی کے ناقابل تھی۔ عمرِ گزشتہ کی طویل جدوجہد میں میری خیرخواہانہ کوشش اور مصلحانہ آواز سلاطینِ مشرق کے کانوں میں نہ اتر سکی، اور سب کو اتباعِ ہوا و ہوس اور جہالت قبولِ مشورہ سے مانع رہے۔"

مرض الموت اور وفات:۔

نظربندی اور پریشانی کی اس حالت میں سید صاحب مرضِ سرطان میں مبتلا ہو گئے۔ ڈاکٹر جمیل پاشا ان کے معالج تھے۔ صحت یابی کے لئے ان کے دانت نکال دیئے گئے، لیکن اس کے مرض پھر زور پکڑ جاتا۔ اس حالت میں آپ نے علاج کی غرض سے دبانا

جانے کی اجازت طلب کی، مگر سلطان نے اجازت نہیں دی۔ آخر چند روز مرض کی تکلیف برداشت کر کے ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو انتقال فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
بوقت وفات ان کی عمر سن عیسوی کے حساب سے ۵۸ سال اور سن ہجری کے حساب سے ۶۰ سال ہوئی۔ انتقال سے پیشتر ان کے الفاظ یہ تھے:۔
"مشرق کی آزادی اور ممالک اسلامیہ کے اتحاد کے متعلق اگرچہ میرا خواب میری زندگی میں شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکا، لیکن مجھے یقین ہے کہ بعد وفات مستقبل قریب میں میری یہ آرزو عملی جامہ پہنے گی۔ صاحب نیت کے معدوم ہو جانے سے نیت ہرگز معدوم نہیں ہو سکتی، اور اس کا عمل بلا استقلال جاری رہے گا۔"

نظر بندی کے زمانہ میں اس فقید المثال اور ناقابل فراموش داعی اتحاد نے اپنے ایک ایرانی دوست کو خط لکھا تھا، جو غالباً ان کا آخری خط تھا۔ یہ خط ان کے نفس کی باطنی کیفیات، ان کے بلند ارادوں اور ان کے اسلامی جذبات و افکار کا ایک مجلہ آئینہ ہے۔ اس خط میں جو ان کے خلوص اور افکار عالیہ کا آخری مظاہرہ ہے، ان کے الفاظ ایک آخری وصیت کا وزن رکھتے ہیں:۔
"میں یہ خط[1] ایک ایسے موقع پر اپنے محبوب دوست کی جانب لکھ رہا ہوں جب کہ میں صرف سلطان اور اس کے رفقاء کی مجلس میں محبوس ہوں، اور دوستوں کی ملاقات سے محروم ہوں۔ ایسے ماحول میں نہ تو مجھے آزادی اور خود مختاری کا انتظار ہے، اور نہ دنیائے دنی میں طویل زندگی کی خواہش۔ ایسے حالات میں نہ تو میں اپنی گرفتاری پر حیران و مضطرب ہوں، اور نہ

[1] اسلامی حسن فارسی سے ہو ۔ مہ

سلطان جابر کے ہاتھوں قتل کئے جانے پر خوفزدہ. خدمت اسلام اور دعوت اخوت و اتحاد کے جرم پر نہایت مسرور ہوں قید و حبس میں، اور مطمئن ہو قتل کئے جانے پر۔ میں محبوس ہوں تو صرف آزادی نوع کے لئے، اور اگر قتل کیا جاؤں گا تو نجات قوم و ملت کے لئے۔ لیکن مجھے رنج و افسوس اس چیز کا ہے کہ میں جس مقصد کی تکمیل کا آرزومند تھا، اس کی تکمیل انتہائی جدوجہد کے باوجود اب تک نہ ہو سکی، اور میرے مخاطبین کی سعادت و بدبختی نے انہیں اتنی توفیق نہ دی کہ میں سرزمین مشرق کی عام بیداری دیکھ سکوں، اور ان کے دست جہالت نے اتنی فرصت نہ دی کہ حلقوم مشرق سے صدائے آزادی سن سکوں۔ اے کاش! میں بادشاہوں اور فرمانرواؤں کو مخاطب کرنے کی بجائے قوم و ملت اور عوام الناس کی قابل و زرخیز کھیتی میں اپنے افکار کے بیج بکھیرتا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اپنے پھل لانے تخم ہائے افکار سلطنت و حکومت کی زمین شورہ زار میں بکھیر کر انہیں برباد و لاحاصل نہ کرتا۔ افسوس کہ میں نے سلطنت کی کھیتی میں جو کچھ بھی بویا وہ نمود اور بار آور نہ ہو سکا، کیونکہ یہ زمین ہی میری تخم ریزی کے ناقابل تھی۔ عمر گذشتہ کی طویل جدوجہد میں میری خیر خواہانہ کوشش اور مصلحانہ آواز سلاطین مشرق کے کانوں میں نہ اتر سکی، اور سب کو اتباع ہوا و ہوس اور جہالت قبول مشورہ سے مانع رہے۔ مجھے ایران سے خاص توقعات تھیں، لیکن انہوں نے بھی میری بے غرض محنت و کاوش کا اجر ذاتی رنج و غضب سے ضائع کر دیا، اور ہزاروں وعدے کر کے مجھے اقلیم ترکیہ کی جانب روانہ کیا۔ الغرض ایران ہو یا ترکیہ،

ان لوگوں نے مجھے محض اپنے غیظ و غضب سے مرعوب کر لینا چاہا، اور اس حقیقت سے غافل رہے کہ کسی کا جبر و تشدد وجہ انہدامِ نیت نہیں ہو سکتا، اور حادثاتِ روزگار احکام و افعالِ حق کو ضبط نہیں کر سکتے۔

لہٰذا میں آپ جیسے گرامی قدر دوست سے یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ میرا یہ آخری خط ایران میں میرے ہم مسلک و ہم خیال دوستوں تک پہنچائیں، اور ان سے زبانی بھی عرض کریں کہ آپ لوگ ہی ایران کا پختہ میوہ ہیں لہٰذا بیداری ایران کے لئے کمرِ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوں، اور حکومت کے قید و حبس اور قتل و قتال سے ہرگز خائف نہ ہوں۔ آپ لوگوں کو نہ تو باشندگانِ ایران کی عام جہالت سے شکستہ خاطر ہونا چاہیے، اور نہ سلاطین کی مذموم و وحشیانہ حرکات سے مرعوب و مغلوب۔ آزادی و خوشحالی کے لئے تیز رفتاری سے کوشش کیجیے، اور اپنی کوشش میں چالاکی، دور اندیشی اور سلیقہ مندی کو اپنا شعار بنائیے۔ طبیعت آپ لوگوں کے موافق ہے، اور حق تعالیٰ اس نیک مقصد میں مددگار ہے۔ میری یہ بات ہرگز نہ بھولئے کہ ایک سیلِ تجدید و اصلاح انتہائی تیزی سے مشرق کی طرف جاری ہے، اور اس کے ناقابلِ مقاومت حملوں کے سامنے مطلق العنان حکومت کی بنیادیں منہدم ہو جانے والی ہیں۔ لہٰذا آپ لوگوں کو یہ سعادت کیوں حاصل نہ ہو کہ آپ کے ہاتھوں قصرِ استبداد کی بنیادیں اکھڑ جائیں وہ موانع، جو آپ اور آپ کے نصب العین کے درمیان حائل ہیں، ایمانِ محکم اور سعی پیہم سے رفع ہو سکتے ہیں!

اس خط کے اختصار و اجمال میں سید صاحب نے اپنی زندگی کے فلسفہ کی پوری تشریح و توضیح کر دی ہے۔ یہ ان کی آخری وصیت، آخری پیغام، آخری آواز اہل نظر کے دلوں میں تقریباً ستر برس کے بعد آج بھی گونج رہی ہے سننے والے اس کو سن رہے ہیں، اور "سیل تجدید" کے ساتھ بڑھنے والے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ایشیا کا بیشتر حصہ آزاد ہو چکا ہے، شہنشاہیت کا جادو ہر ملک میں ٹوٹنے لگا ہے، جمہوریت اپنی قدرتی اور فطری اقدار کے ساتھ قیام پذیر ہو رہی ہے، اور اغیار کی پے در پے ٹھوکریں کھانے کے بعد اسلامی ممالک عالمگیر اخوت و اتحاد کی قدر و قیمت سمجھنے لگے ہیں، اور جمال الدین افغانی کا خواب اپنی پوری تجلی و تابانی کے ساتھ ہر خطہ مشرق میں تعبیر و اظہار کا جامہ پہن رہا ہے سبب ہنگامہ محفل محو خواب ابد ہے مگر وہ محفل بدستور قائم ہے اور اس کی آرائش و تزئین کی جا رہی ہے۔ لہٰذا پیغمبر اتحاد کا یہ حکیمانہ قول ہر گوش حقیقت نیوش میں آج بھی گونج رہا ہے:۔

"انعدام صاحب نیت اسباب انعدام نیت نمی شود!"

ترجمہ "صاحب نیت کے معدوم ہو جانے سے نیت ہرگز معدوم نہیں ہو سکتی"۔

یہی وہ یقین محکم تھا جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر اور سمندر کی طوفانی موجوں میں جمال الدین کو سرفراز رکھے گیا، اور مصائب و موانع اس کے پائے عزم و استقلال میں لغزش پیدا نہ کر سکے۔ وہ جسد خاکی فانی ہو چکا، مگر اس کی روح فعال ہمیشہ زندہ ہے!

بالآخر افادہ عام کے لئے آپ کے چند اقوال درج ذیل کرتے ہیں:۔

۱۔ جب آپ مصر سے جا رہے تھے، تو شاگردوں میں سے کسی نے کہا:۔

"آپ اپنی یادگار کے طور پر کوئی کتاب تصنیف کیجئے!" آپ نے جواباً فرمایا!

میں کتابیں لکھتا نہیں، بلکہ میں زندہ کتابیں تصنیف کر رہا ہوں ا؎"

۲۔ "مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے متعلق اہل یورپ سے شکوہ کرنا، یا انہیں سبب زوال سمجھنا بالکل غلط ہے۔ درحقیقت مسلمانو کے زوال و ذلت کا باعث ان ہی کے اندرونی انحلاط فاسدہ، اور فکر و عمل کی خامیاں ہیں"

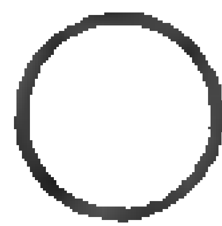
۳۔ "دین حق وہ ہے جو محکم دلائل و براہین رکھے، اور محض انسانی تصورات مفروضات پر مبنی نہ ہو"

۴۔ "اکلِ حلال اور صدقِ مقال مومن کی دو واضح علامتی صفات ہیں۔ جو شخص رزق و روزی میں حلال و حرام کا امتیاز نہیں کرتا اور اپنی گفتار میں خوفِ سلطان یا مصلحت وقت کے تحت جھوٹ بولتا ہے، اسے مومن ہرگز نہیں سمجھا جا سکتا"

۵۔ نوجوانوں کے لئے ادب و تہذیب زیورِ کمال ہے لیکن ادب و تہذیب ہی پر اکتفا کر کے علم و عمل کے کمالات حاصل کرنے میں غفلت و تساہل کرنا بھی دوں ہمتی اور پست فطرتی کی دلیل ہے، کیونکہ علم و عمل کے لئے حیاتِ انسانی میں کوئی انتہا نہیں"

ا؎ مطلب یہ کہ میں مسلمانوں کے قلب و دماغ میں حریت و آزادی اور عالم گیر اخوت اتحاد کے لئے تخم ریزی کر رہا ہوں۔ جہاں بھی جوہر قابل ہو گا، میرے پیغام کو قوت سے عمل میں لائے گا۔

حکام وقت یا جاہل و بدعقیدہ لوگوں کی ملامت سے خائف ہو کر اسلام کے ابدی حقائق بیان نہ کرنا، قوم و ملت کو ہمیشہ ذلت و تنزل میں رکھتا ہے۔ دینِ حق اور مسلمانوں نے جب بھی عروج پایا ہے، حق گو، جری اور متقی لوگوں کی بے لوث خدمات سے پایا ہے[1]"



زاہد سلطان پرویز پرنٹر پبلشرز نے نقوش پریس لاہور سے چھپا کر دارالبلاغ لاہور سے شائع کی۔

[1] ماخوذ از "آثارِ جمال الدین افغانی" از قاضی محمد عبدالغفار ص ۲۸۹ تا ۲۹۰ مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند)

۲۵۶

رموزِ زندگی

اس تحفۂ روزگار کتاب میں آسان اور معقول انداز میں انسان کی ذہنی الجھنوں کو رفع کرتے ہوئے کامیاب و خوشحال زندگی کے اصول راز منکشف کئے گئے ہیں۔ علم النفس کے نفع بخش اور صحت مند اصول و ضوابط کو ہر عنوان کے تحت ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اسے مفید ترین مشرقی و مغربی لٹریچر کا نچوڑ تصور کیا جائے۔ مضامین کے عنوان ملاحظہ ہوں۔

۲۔ صلاحیتِ کار ۔ خود اعتمادی ۳۔ شخصیت و کردار

۴۔ ضبطِ نفس کے اصول و قواعد۔ ۵۔ تنظیمِ کار

۶۔ دولتِ وقت۔ ۷۔ قوت حافظہ کی تربیت ۸۔ اپنی تعلیم آپ۔

نہایت ہی مفید اور کار آمد کتاب

تحریر و گفتگو کا فن

مجلسی زندگی میں انسان کی عزت و عظمت تحریر و گفتگو سے ہے۔ یہ عدیم المثال کتاب بتائیگی کہ انسان فطرتی قوتوں کو کس طرح عملی جامہ پہنا کر روزمرہ کی زندگی میں شستہ و رواں تحریر اور دلچسپ و دلنشین گفتگو اور تقریر کر سکتا ہے۔

قابل قدر کتاب

دار البلاغ ۔ محمد نگر ۔ اقبال روڈ ۔ لاہور نمبر ۵

مشاہیرِ اسلام موت کے آغوش میں

ابتداءِ اسلام ایک زندہ تحریک تھی۔ اس تحریک کے علمبردار خدا کی ہستی پر کامل یقین رکھتے تھے۔ موت کے بعد ابدی زندگی کی صداقت پر ان کا ایمان تھا۔ حشر و نشر اور دوزخ و بہشت کو وہ دل سے مانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی زندگیاں مثالی تھیں۔ وہ اس ناپائدار زندگی کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ موت کا سچا نقشہ زندگی اور بھرپور زندگی میں بھی اُن کے قلب و ذہن پر ثبت رہتا تھا۔ اگر اسی تصورِ حیات کو ہم زندگی میں جاری و ساری رکھ سکیں تو شاید ہم سے بہت ہی کم غلطیاں سرزد ہوں اور موت کے وقت ہمیں زیادہ پریشان نہ ہونا پڑے۔

یہ کتاب اسی پاکیزہ جذبے کے پیشِ نظر مرتب کی گئی ہے تاکہ اس کے مطالعے سے عبرت و فکر کی نئی راہیں کھل سکیں۔ ناسمجھ انسان زندگی کے چکر میں پھنس کر دنیائے دُوں کی الجھنوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی مفید کتاب آنکھیں کھول دے گی اور قارئین زندگی کی اتھاہ گہرائیوں کو پا سکیں گے۔ مشہور و نامور مصنف جناب عبدالرحمٰن صاحب طارق نے مشاہیرِ اسلام کی زندگی کے اُس حصے پر بطورِ خاص روشنی ڈالی ہے جب اُن کی زندگی کے چراغ گل ہو رہے تھے۔ اس وقت کے احساسات و خیالات کو اس خوبی سے پیش کیا گیا ہے کہ قارئین اپنے حالات و ماحول سے اُن کا تقابل کر کے اپنی زندگی کو بہتر اور پاکیزہ بنا سکیں۔

خواجہ بدرالاسلام فروغی
ڈائرکٹر دارالبلاغ۔ لاہور

قیمت 4|50